Regd. L. NO. 7243

Phone. 80300

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1977

اس پرچہ میں :

۱۔ آزادی کا قرآنی مفہوم

۲۔ پاکستان کا ازلی دشمن

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۔۔ ۱۸/ روپے بیرونی ممالک ۔۔ ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	اگست ۱۹۷۷ء	شمارہ ۸

فہرست

۱۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲

۲۔ آزادی کا قرآنی مفہوم ۔ ۔ ۔ (محترم پرویز صاحب) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰

۳۔ پاکستان کا ازلی دشمن ۔ ۔ ۔ (" " ") ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۹

۴۔ بزمِ مذاکرہ ۔ (منعقدہ کنونشن ۷۶ء ۔ قسط ششم) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۴ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دنیا رزم گاہِ حوادث ہے۔ یہاں ہر آن نئے نئے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ سطح بین لوگ ان حادثات سے پریشان بھی ہو جاتے ہیں اور مایوس بھی۔ لیکن جن لوگوں کا ابدی صداقتوں پر یقین ہوتا ہے، وہ نہ ان سے پریشان ہوتے ہیں نہ مایوس۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (21/103) "بڑے سے بڑا حادثہ بھی انہیں پریشان نہیں کرتا"۔ ان ابدی صداقتوں میں ایک عظیم (اور ہمارے نزدیک بنیادی) صداقت وہ ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (9/33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ حیات دے کر بھیجا۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ نظام، انسانوں کے تمام خودساختہ نظامہائے حیات پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ امر مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ نظامِ حیات جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں عطا کیا ہے، تمام نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہے گا۔ "دیگر تمام نظامہائے حیات پر غالب آنے" سے مراد یہ ہے کہ آخر الامر عالمِ انسانیت میں یہی نظام رائج ہوگا۔ اس نظام کے غالب آنے کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک جماعت اس نظام کا خالص اور منزہ تصور لے کر اٹھے اور ہر مخالف قوت کا مقابلہ کر کے، اسے عملاً قائم کر دے۔ (ہم نے "خالص اور منزہ تصور" اس لئے کہا ہے کہ اگر اس نظام میں جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں عطا کیا ہے، انسانی تصورات کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے) صدرِ اوّل میں ——— محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے اس طریق پر عمل کرتے ہوئے اس نظام کو ایک خطۂ زمین میں چند سالوں میں نافذ کر کے دکھا دیا۔ جب دنیا میں اس قسم کی جماعت موجود نہ ہو، تو اس مقصد کے لئے فطرت کا طریقِ کار عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ اسے عقلِ انسانی کا تجرباتی طریق بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے، انسان ایک نظام وضع کرتا ہے۔ بہ ہزار مشکل اسے کسی جگہ قائم کرتا ہے۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام ناقص ہے۔ پھر اسے چھوڑ کر، کوئی دوسرا نظام وضع اور اختیار کرتا ہے۔ ان ناکام تجاربہ میں صدیاں صرف ہو جاتی ہیں اور ان تغیرات میں ہر قسم کی تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ——— لیکن ہر

ناکام تجربہ کے بعد، انسان کا جو نیا قدم اٹھتا ہے، اس کی سمت، غیر شعوری طور پر، اس نظام کی طرف ہوتی ہے جسے قرآنِ کریم نے دینِ الحق کہہ کر پکارا ہے۔ جن لوگوں کا اس حقیقت پر ایمان ہوتا ہے کہ یہ تغیرات اس نظام کے قیام کی راہ ہموار کرتے ہیں، وہ ان سے گھبراتے نہیں، بلکہ مطمئن ہوتے ہیں کہ کاروانِ انسانیت ایک قدم اور اس منزل کے قریب آ گیا۔ ان کے نزدیک ہر ستارے کا غروب ہو جانا صبحِ روشن کی نوید ہوتا ہے۔

صدرِ اوّل کے بعد، فطرت کا یہ تدریجی تغیراتی پروگرام جاری تھا کہ آج سے قریب پچاس سال پہلے ہندوستان میں، ایک مردِ دانا کے ذہن میں، جسے فطرت نے قرآنی بصیرت کی روشنی سے نوازا تھا، یہ تصور ابھرا کہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اُسی پروگرام کو اختیار کیا جائے جس سے یہ نظام (صدرِ اوّل) میں چند سالوں میں عملاً متشکل ہو گیا تھا۔ یہ مردِ دانا تھا، حکیم الامت علامہ اقبالؒ، جس کی نگہ بصیرت نے ۱۹۳۰ء میں یہ پروگرام پیش کیا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام رائج نہ ہو، اور وہاں قرآنی نظام (دینِ الحق) قائم کیا جائے۔ مطالبۂ پاکستان کی تحریک اسی پروگرام کی اوّلین کڑی تھی۔ علامہ اقبالؒ کی قرآنی فکر اور قائدِ اعظمؒ (محمد علی جناحؒ) کی عملی جدوجہد نے اس اسکیم کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور پاکستان کا خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ صرف ایک خطۂ زمین کے حصول کی کوششوں میں مصروف نہیں تھے۔ ان کے سامنے یہ سوال بھی تھا کہ اس خطۂ زمین میں اسلامی مملکت (یا اسلامی نظام) کے تمکن کی صورت کیا ہو گی، بالفاظِ دیگر، یہ سوال کہ اس مملکت میں آئین اور قوانین سازی کا اصول کیا ہو گا۔ علامہ اقبالؒ تمام عمر اس حقیقت کو عام کرتے رہے کہ اسلامی قوانین کی اصل اور بنیاد، خدا کی کتاب، قرآنِ مجید ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں (اپنے خطبات میں) اس حقیقت کو ان دانشگاف الفاظ میں بیان کیا کہ:-

> وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت ترکوں کے۔ اور جو زود یا بدیر، دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقا کی گنجائش ہے یا نہیں ــــ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے ــــ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-
>
> حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔)

(ضمناً) "حسبنا کتاب اللہ" کا نظریہ یا عقیدہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ کے اپنے ذہن کی اختراع نہیں تھا۔ یہ تو خود قرآنِ مجید کے اس دعوے کا اعلان تھا جس کی رو سے اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ:-

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ۔ (۲۹/۵۱)

کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف (اے رسول) یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے

سامنے پیش کیا جاتا ہے ؟
خود رسُول اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ :-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)

تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے منزل من اللہ کتاب ۔ قرآنِ مجید کے مطابق کیا کرو۔

قائدِ اعظمؒ نے اس حقیقت کو ۱۹۴۱ء میں واضح الفاظ میں بیان کیا تھا جب کہا تھا کہ :-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ اظہار ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً، نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی ۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے ۔

لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب اس مملکت میں آئین اور قانون سازی کا مرحلہ سامنے آیا تو اس وقت نہ علامہ اقبالؒ ہم میں موجود تھے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ ۔ اگر وہ موجود ہوتے تو وہ، اپنے پیش کردہ اصول کے مطابق، ایسا آئین اور ضابطۂ قوانین مرتب کر دیتے جو اسلامی نظام کے آئینہ دار ہوتے، اور اس طرح ابتداءً ایک خطۂ زمین میں دینِ الحق کے غالب آنے کا دعویٰ عملی شکل اختیار کر لیتا۔

جب یہاں آئین مرتب کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، تو علماء حضرات نے فرمایا کہ یہ خطۂ زمین اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے، اور چونکہ اسلام کا علم ہم رکھتے ہیں، اس لئے ہم ہی اس کے لئے آئین اور ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ مملکت کا ضابطۂ قوانین ایسا ہونا چاہیئے جو سب کے نزدیک اسلامی ہو، اور آپ حضرات مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ایک کے نزدیک اسلامی ہے، وہ دوسرے (بلکہ دوسروں) کے نزدیک خلافِ اسلام ہے۔ اس لئے آپ اپنے اپنے فرقہ پر قائم رہتے ہوئے ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کر سکیں گے جسے (آپ) سب اسلامی تسلیم کر لیں! انہوں نے کہا کہ ہم ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کئے دیتے تھے۔ اس سے اس اعتراض کا جواب مل جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں پر مشتمل اکتیس علماء نے یہ (متفق علیہ) فارمولا پیش فرمایا کہ :-

مملکت کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہوں گے ۔

طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے، نہ کسی سیاسی جماعت سے۔ لیکن قرآنی نظام کا قیام اس کا جزوِ ایمان ہے۔ اس لئے وہ ہر اس کوشش کی تائید کرتا ہے جو اس نظام کے قیام میں ممد و معاون ہو، اور ہر اس اقدام کی مخالفت جو اس کی راہ میں حائل ہو۔ سطحِ بیں نگاہوں کے لئے علماء کرام کا یہ مطالبہ بڑا اطمینان بخش تھا لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ جب اس فارمولا پر عمل کرنے

کا وقت آیا تو اس سے ایسے شدید فرقہ دارانہ اختلافات ابھریں گے، جن سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت اسلامی نہیں بن سکے گی بلکہ خود اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اپنے اس احساس کے تقاضا سے ہم نے ان حضرات کی خدمت میں عرض کیا کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہو۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔

(۱) یہاں مختلف فرقے ہیں۔ اور ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ (ضابطہ، قوانین) ہے۔

(۲) ہر فرقہ اپنی فقہ کو کتاب و سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اپنی فقہ کے سوا، ہر فرقہ کی فقہ کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے۔

(۳) اس لئے آپ کس طرح ایسا ضابطہ، قوانین مرتب کر سکیں گے جسے یہ تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔

اس کا ان حضرات کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، بجز اس کے کہ انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ سنت ہے۔ اور اس کے بعد اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔

برسوں تک ایک طرف طلوعِ اسلام کے خلاف یہ پراپیگنڈہ جاری رہا، اور دوسری طرف، ہر حکومت کے خلاف یہ الزام کہ یہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ تا آنکہ صدر ایوب (مرحوم) نے اواخر ۱۹۶۸ء میں یہ تجویز پیش کر دی کہ:-

> اپوزیشن کے راہ نماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ، اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر مسلمانوں میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے، جس طرح خدا اور رسول کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قوانین تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔
>
> (نوائے وقت۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کی اس سے زیادہ موزوں تجویز اور کونسی ہو سکتی تھی، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ صدر ایوب (مرحوم) کی اس دعوت کا جواب کیا ملا؟ یہ کہ یہ شخص (صدر ایوب) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ مہمیز بنا رہا ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۹ء)۔

ہم اس جواب کی معقولیت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، لیکن اس حقیقت کو تو قارئین خود سمجھ جائیں گے

کہ اس تجویز پر لبیک کیوں نہیں کہا گیا تھا!

بہرحال، طلوعِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ بدستور جاری رہا، تاآنکہ، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، مودودی صاحب کو اعتراف کرنا پڑا کہ طلوعِ اسلام ٹھیک کہتا تھا۔

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں، جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (ایشیا۔ ۲۳ راگست ۱۹۷۷ء)

مودودی صاحب نے یہ فرمایا اور علماء میں سے کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود مطالبہ یہ جاری رکھا کہ مملکت کے قوانین، کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ حالیہ (مارچ ۱۹۷۷ء کے) انتخابات میں یہی مطالبہ "نظامِ مصطفیٰ" کے الفاظ میں دہرایا گیا۔

مودودی صاحب کا مندرجہ بالا اعتراف و اعلان، قرآنی نظام کی طرف ایک اقدام ہی نہیں۔ یہ، ملّت کو اس مقام پر لا کھڑا کر دیتا ہے جہاں یہ سوچنا پڑے گا کہ اگر "کتاب و سنت" اسلامی قوانین کے لئے متفق علیہ بنیاد نہیں بن سکتے تو پھر اس کی بنیاد کیا ہے؟ اقبالؒ کے الفاظ میں، یہ سوال ابھر کر سامنے آئے گا کہ؛ ـــ

بلکہ می خواہی نظامِ عالمے — جستہٗ او را اساسِ محکمے؟

اب ملک میں پھر نئے انتخابات ہوں گے۔ اگر ان میں، مدعیانِ اسلامی نظام کو اکثریت حاصل ہو گئی، اور اس طرح زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گئی، تو تشکیلِ حکومت کے بعد، سب سے پہلا سوال جو ان کے سامنے آئے گا وہ اسلامی قوانین وضع کرنے کا ہو گا۔ اُس وقت نظری اصطلاحات سے کام نہیں چلے گا۔ اُس وقت یہ مسئلہ عملی شکل اختیار کر لے گا، اور جس حقیقت کا سامنا کرنے سے یہ حضرات اب تک گریز کرتے چلے آ رہے ہیں، وہ بے نقاب ہو کر ان کے سامنے کھڑی ہو گی یعنی مختلف فرقوں کے علماء حضرات کے سامنے یہ سوال آئے گا کہ وہ ایک متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کریں۔ اُس وقت مجلس قانون ساز کا جو نقشہ ہو گا اسے چشمِ تصور کے سامنے لانے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئیے۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ چونکہ ان تمام حضرات نے جمہوری نظام کو تسلیم کر رکھا ہے، اس لئے جو قوانین اکثریت مرتب کرے گی، انہیں سب کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ دلیل اس سے پہلے سامنے آ چکی ہے۔ جب مودودی صاحب نے کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، تو ان سے پوچھا گیا تھا کہ پھر مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کی صورت کیا ہو گی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ چونکہ ملک کی اکثریت حنفی فقہ کی پیرو ہے اس لئے اس فقہ کو مملکت کا قانون بنا دیا جائے گا۔ اس پر ان فرقوں نے، جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہیں، طوفان برپا کر دیا تھا۔ اُس وقت یہ "طوفان" نظری تھا کیونکہ قانون سازی کے سوال نے ہنوز عملی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن جب یہ سوال عملی شکل اختیار کرے گا تو اُس وقت یہ طوفان بھی عملی شکل اختیار کر لے گا۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا، یہ ہم سے نہیں،

تاریخ سے پوچھئے۔

——اتنی بات تو بدیہی ہے کہ اس سے مملکت میں کوئی حکومت مستحکم طور پر قائم نہیں ہو سکے گی اور خود مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، اور سیکولر نظام کی حامی جماعتوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ مذہب کی بنیادوں پر کوئی نظامِ حکومت قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اِس وقت پاکستان میں اگر کوئی ایسا طبقہ ہے۔ (اور ہمیں یقین ہے کہ ایسا طبقہ موجود ہے) جو دل میں اسلام کا درد رکھتا ہے۔ جو پاکستان میں صحیح اسلامی نظام دیکھنے کا متمنی ہے، جو جذبات سے بالاتر ہو کر، علم و بصیرت کی رو سے، ٹھنڈے دل سے معاملات پر غور و فکر کرنے کا اہل ہے، تو ہم اس طبقہ سے اپیل کریں گے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ وہ مملکت کو اس انجام سے بچانے، اور اسلام کو اس قسم کے تاثر سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ بات بالکل واضح ہے۔ ہمارے ہاں، احادیث کے مجموعے بھی ہر فرقے کے الگ الگ ہیں۔ سنت کی تعریف (DEFINITION) تک ہر فرقہ کی جداگانہ ہے۔ فقہ کے ضوابط بھی ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہیں۔ لیکن، اس کے باوجود، ایک چیز ایسی ہے جو ان تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اور وہ ہے خدا کی کتاب —— قرآن مجید —— اس سے کوئی فرقہ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر ہمارے آئین میں قوانین کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار، سند اور حجت، قرآنِ مجید کو قرار دے دیا جائے، اور کسی ایسی اتھارٹی کا تعین کر دیا جائے جو اختلافی امور میں فیصلہ دے کہ وہ معاملہ قرآن مجید کے مطابق ہے' یا نہیں، تو یہ مملکت قائم بھی رہ سکتی ہے اور اسلامی بھی بن سکتی ہے۔

(۱) خدا کی کتاب کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار اس لئے کہ خود خدا نے فرما دیا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۲) خود رسول اللہ کو یہی حکم دیا گیا تھا:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)

ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔

لہٰذا، جو نظام حضورؐ نے قائم فرمایا تھا اس میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوتے تھے —— یہی "نظامِ مصطفےٰ" تھا۔

(۳) حضورؐ خود اسی کا اتباع کرتے تھے۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰى إِلَيَّ۔ (۴۶/۹)

میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن مجید۔

لہٰذا، قرآن مجید کا اتباع، سنتِ رسول اللہؐ ہے۔

(۴) اختلافات کا فیصلہ کتاب اللہ کی رو سے کیا جائے گا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۔ (۴۲/۱۰)

جس معاملہ میں تمہیں اختلاف ہو جائے، اس کا فیصلہ خدا کے ہاں سے لیا کرو۔

اگر مجلسِ قانون ساز کوئی قانون وضع کرے، یا انتظامیہ کوئی حکم دے، اور اس بات میں اختلاف ہو جائے کہ وہ قانون یا حکم، قرآنِ کریم کے مطابق ہے یا نہیں، تو ملک میں ایسی بلند و بالا اتھارٹی ہونی چاہیئے جو اس امر کا فیصلہ کرے۔ اور وہ عدالت عالیہ ہی ہو سکتی ہے۔

ہم اس طبقہ سے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کو لے کر اُٹھے۔ اس کے متعلق یہ نہ سوچے کہ جب کوئی حکومت قائم ہو جائے گی تو ہم اُس وقت اس سوال کو اٹھائیں گے۔ اُس وقت اس سوال کو کوئی درخورِ اعتنا نہیں قرار دے گا۔ اس اہم سوال کے طے کرنے کا یہی وقت ہے۔ جو پارٹیاں (یا افراد) انتخابات میں حصہ لینے کے لئے آگے آئیں، ان سے پوچھا جائے کہ اگر آپ نے حکومت قائم کی تو آپ کے نزدیک قانون سازی کا اصول کیا ہوگا، اور آپ ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کریں گے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان سے اس بات کا طے کرا لینا، اسلام اور مملکتِ پاکستان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اگر علمائے حضرات کہیں کہ ایسا ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائیگا تو ان سے کہئے کہ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ ایسا ناممکن ہے۔ کیا آپ ان سے متفق ہیں۔ اگر آپ متفق ہیں تو قانون سازی کے وقت، اُن کے ساتھ آپ کے اس اختلاف کو مٹانے کی کیا صورت ہوگی؟ بہرحال، آئندہ انتخابات میں ووٹ دینے سے پہلے آپ مختلف پارٹیوں سے اس بنیادی سوال کا متعین جواب ضرور لیں تاکہ بعد میں جھگڑے پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔

(۲)

مسلمانانِ ہند ہی کی نہیں، عالمِ اسلام کی تاریخ میں ۱۴ اگست (۱۹۴۷ء) کا دن بڑی اہمیت رکھتا ہے جب ملتِ اسلامیہ (ہند میں) نے اس مقصد کے لئے ایک مملکت حاصل کی کہ اس میں کتاب اللہ کی حکمرانی ہو۔ اگر ہماری قوم کا سیاسی اور دینی شعور بیدار ہوتا، اور زعمائے قوم کرسیوں کی رسہ کشی میں نبرد آزما نہ ہوتے، تو اس دن کی یاد پورے تزک و احتشام کے ساتھ منائی جایا کرتی۔ لیکن قوم نے اسے نسیاً منسیا کر دیا۔ چونکہ طلوعِ اسلام کے نزدیک اس مملکت کے قیام کا مقصد جذبۂ ایمان ہے اس لئے وہ اپنی بساط کے مطابق، ہر سال اس یاد کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ امسال بھی آپ (چند صفحات آگے جا کر) ایک مقالہ دیکھیں گے جس میں بتایا گیا ہے کہ آزادی کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ (۲) گذشتہ ہنگاموں میں عام ذہنوں پر تو یہ سوال مسلط تھا کہ مملکت کا اقتدار کس کے حصے میں آتا ہے، اور ہم اس احساس سے لرزاں و ترساں تھے کہ چند ہی قدم کے فاصلے پر وہ سلطنت (بھارت) کھڑی ہے جو مملکتِ پاکستان کی ازلی دشمن ہے اور شروع سے اس گھات میں چلی آ رہی ہے کہ چھاپہ مار کر اسے اُچک کر لے جائے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ہم اہلِ پاکستان کو ایک بار پھر اس خطرہ سے متنبہ کر دیں۔ چنانچہ اس اشاعت میں دوسرے مقالہ کا موضوع یہی ہے۔ یہ موضوعات ایسے ہیں جنہیں بار بار سامنے لانے کی ضرورت ہے اس لئے ہم اس تکرار کیلئے کسی معذرت کو ضروری نہیں سمجھتے۔

اور ـــــ تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو ـــــ کہ اگلا مہینہ "ستمبر" کا ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**کمالیہ** میں ہر جمعہ ۴½ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) (لائلپور) دفتر بزم طلوع اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار
لیہ میں ہفتہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر خان کے مکان (نمبر ۴۵ وارڈ نمبر ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی سکول (بذریعہ ٹیپ)	**جام پور** میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازی خان) بلوچ جنرل اسٹور۔ اڈہ روڈ
کراچی میں (عارضی طور پر) ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کمرہ ۲-A ٹاور مینشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ	**ملتان** میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) (فون ۷۲۰۷۱) دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔
لائلپور میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۲۹۳۴) ۶۵ کوتوالی روڈ۔ حیات سرجری کلینک	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/۱/بی۔ کشمیر روڈ (بذریعہ ٹیپ)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ	**جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

ضرورتِ رشتہ

ایک موزوں قامت، خوش شکل دوشیزہ (عمر ۲۳ سال) کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کی تعلیمی قابلیت۔ B.Sc ، B.Ed. (کراچی) اور آئرلینڈ سے نیشنل سائنس کا مکمل کردہ کورس جو فوڈ انڈسٹری میں کام آتا ہے۔ آجکل عارضی طور پر لندن میں مقیم ہے۔ لہٰذا (U.K.) میں مقیم لڑکا قابلِ ترجیح ہوگا۔ خط و کتابت بصیغہ راز۔

(م۔ ی معرفت ادارہ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲ لاہور)

آزادی کا قرآنی مفہوم

(پاکستان میں "یومِ آزادی" تیس برس سے ہر سال آتا ہے اور اسے کسی نہ کسی رنگ میں منایا بھی جاتا ہے لیکن اس حقیقت پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک (یعنی قرآنی نقطۂ نگاہ سے) ــــ "آزادی" کا مفہوم کیا ہے، اور آزادی کے اس مفہوم کی رو سے، کیا ہم آزاد کہلانے کے مستحق ہیں؟ چار سال پہلے کی بات ہے کہ پرویز صاحب نے یومِ آزادی کی تقریب پر (اگست ۱۹۷۳ء میں) اس موضوع پر ایک خصوصی درس دیا تھا جسے ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ بات تو چار سال پہلے کی ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں، ان حقائق کا سامنے لانا اس زمانے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس خطاب کو، بعد از نظرِ ثانی پیشِ خدمت قارئین کرتے ہیں۔)

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

اگست ۱۹۶۲ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پندرھویں سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا تھا۔ وہ آج بھی ہر سوچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا۔

انسانی تاریخ کے اوراق آپ کو اُلٹتے جائیے۔ کاغذ سے [illegible] اور حافظوں سے تحریروں، عظمت سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے فاصلوں [illegible] کے اندر [illegible] میں پہنچ جائیے۔ [illegible] کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے زاویے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ [illegible] خیالات بدلیں گے۔ طرزِ بود و باش بدلے گا۔ [illegible] لیکن انسان [illegible] کے اس [illegible] اور اجتماعات [illegible] کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیصِ زمان و مکان ہمیشہ عقیدت کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا کے منکرین مل جائیں گے لیکن

کسی قوم میں ایسا گروہ نہیں ملتا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نادیدہ و نا آشنا زمان و اور اکاسرہ و قیاصرہ دیر ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور اور ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال، دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ناپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ یہاں تک کہ آزادی کا لفظ دنیا کی ہر لغت میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ صد تعجب و موجب ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑیئے، اس باب میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین تعریف (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے، جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے۔ یعنی (SOCIAL JUSTICE) یہ عصرِ حاضر کے ممتاز علمائے سیاست کے چیدہ چیدہ مقالات پر مشتمل ہے جنہیں پروفیسر (RICHARD B. BRANDT) نے ایڈیٹ کیا ہے۔ اس کے ایک مقالہ میں ہابس، سپنسر، کانٹ، مل، ہارٹ، روسو، پاپر، مارکس، انجلز، جیسے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (DEFINITIONS) کو درج کیا گیا ہے اور اس کے بعد بدلائل و شواہد بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی ڈیفینیشن بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام فکری اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سوراجیہ (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی

ضمناً (مہاتما) گاندھی نے مسلمانوں میں رائج اصطلاح — حکومتِ خداوندی — کے مقابلہ میں رام راجیہ کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ وہاں آزادی کے لئے سوراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے

سے یہ تھا کہ ایک غیر قوم، یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر، ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ یہی تحریک آزادی کا منتہیٰ و مقصود تھا۔ اس جدوجہد میں، ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصود و منتہیٰ (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام) کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندو کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصود درست قرار نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک، از روئے اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا تھا کہ اسلام کی رو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علماء حضرات بڑی شدومد سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریز کے وضع کردہ ناقوس کی صدائے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے، افترا ہے۔ جہاں تک انگریز کو ہندوستان سے نکال کر باہر کرنے کا تعلق ہے، مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا، ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہیٰ ہے، مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جدوجہد کا منتہیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ یہ ان کے پیش نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگ میل قرار پا سکتا ہے۔ یہ آواز تھی —

علامہ اقبالؒ کی آواز

حکیم الامت، علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ، ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادئ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا، جسے نہ صرف یہ کہ اس وقت دنیا کا بہترین نظامِ سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابق اسلام ہے۔ اس نے

جمہوریت

اقبال کا اعتراض، اُن کی قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس نظام کو تم بہترین نظام کہتے ہو، آزادی کے عام تصور کی رُو سے بھی اُس کی حقیقت یہ ہے کہ :-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سن رکھو کہ :-

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظامِ ملوکیت۔ اس نظام کے تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا، ہندو کی تحریکِ آزادی کے خلاف، مسلمان اُسی طرح نبرد آزما رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف محاذ آرا ہیں۔ اس کے بعد جب تحریکِ آزادی کی زمامِ قیادت، قائداعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ :-

ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ..... مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشو ونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریرِ محمد علی جناحؒ - جلد دوم - صفحہ ۳۳۳ تا ۳۳۴)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ ہماری یہ محاذ آرائی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کر لیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے منفرد مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کر لیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اُس جمہوری نظام کو رائج کر لیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہیں تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبدادِ ملوکیت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوعِ انسان کبھی آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آ سکتی جو اُسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان ہر دو دعاوی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد، مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں حقیقی آزادی، نصیب ہو گئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق خود مغرب کے اربابِ فکر و دانش اب

کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول

مغرب کے جمہوری نظام (ڈیماکریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں :-

۱۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدار مطلق حاصل ہے۔ (DEMO-CRACY.) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

۲۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

۳۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

۴۔ ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حرفِ آخر ہوتے ہیں۔ جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

۵۔ عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرتا ہوتا ہے جن کی رو سے وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔

۶۔ برسرِ اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اُسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام بھی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے ارباب فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان ارباب علم و دانش کے نتائجِ فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

یورپ کا انقلاب

اقوامِ یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بُری طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور اربابِ کلیسا کی تھیا کریسی ———— تھیا کریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے۔ جس نے کہا تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے اور اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور ملوکیت شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیاراتِ خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے، لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ

انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف پرچ کو۔ لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا، کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آکر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریہ حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حقِ اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے، نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یوں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا، اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرینِ یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و انبساط سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اسے نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریۂ جمہوریت (ڈیماکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبادِ ملوکیت اور قہرمانی مذہبی پیشوائیت سے حصولِ نجات پر منفعلانہ ردِ عمل تھا۔ نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرینِ مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں، میں اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں ــــ مزید تصریحات اب پیشِ خدمت ہیں۔ مفکرینِ مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ــــ (EWING.) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

> اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (حوالہ ۱ تمام حوالے خطاب کے آخر میں ملیں گے۔)

اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانسیسی مفکر لیبن گوٹن اس باب میں لکھتا ہے کہ:-

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ بھی برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں۔ وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔ (حوالہ ۲)

شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (ALAN GEWIRTH) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:-

> اس نظام میں پبلک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض مؤثر پارٹیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نظریۂ جمہوریت جوشِ خطابت کا پیدا کردہ افترا ہے جس میں

صداقت، نیکی اور حسنِ عمل کے الفاظ کے حربے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدانِ کارزار یا مارکیٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ (حوالہ ۳)

اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے، اور جو حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہو، اس کی فرماں پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام میں برسرِاقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں ہوتا، عوام کی بطیبِ خاطر رضامندی پر مبنی نظامِ اطاعت ہوتا ہے۔ پروفیسر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ (یہ مفروضہ بھی محض افسانہ ہے) :-

اس نظام میں لوگ حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے۔ جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے، ان کی اطاعت کو بطیبِ خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ (حوالہ ۴)

جمہوری نظام میں، روسو کے مفروضہ کے مطابق، حقِ اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلاحدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ :-

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اسے یکساں حقِ مطلق انسانی عطا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۹۵)

اس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبالؒ کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے نصف صدی پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیشِ خدمت کر چکا ہوں کہ :-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمعِ قرآنی سے کسبِ ضیا کرتی ہو، وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــــ کہ خامہ دیدہ احوالِ جہاں گفتن ــــ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی "دعویٰ" کے) کہہ سکتا ہے کہ :-

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے   عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

برٹرینڈ نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق سونپنے کا نتیجہ استبداد اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حقِ مطلق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ مدت العمر کے فکری تجسس کے بعد اس باب میں جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ان اربابِ فکر کا کہنا ہے کہ نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل۔ اس سے

عدل سے مراد

بعد عدل کے متعلق ان کی تصریحات اور تقاضے ملاحظہ فرمایئے۔ مشیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (WILLIAM K. FRANKENA) لکھتا ہے کہ:-

عدل، قوانین مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔ (حوالہ ۵)

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہرحال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پا سکتے تو پھر حق و باطل اور (JUST AND UNJUST) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں یہ مفکر، پروفیسر (LEWIS) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:-

حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریت حق کی بنیادی شرط ہے۔ (حوالہ ۶)

نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی ——— یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ کینٹ کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ:-

نیکی، صداقت یا پاکیزگی اور عدل ان سے ابدیت کی کشش نکال دیجئے۔ تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ (EMIL BRUNNER) کا یہ قول درج کرتا ہے کہ:-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی برعدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا۔ جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔ (حوالہ ۷)

ابدی اور غیر متبدل قانون

آکسفورڈ اور کیمبرج کے ایک ممتاز صاحب علم (ERNEST BARKER) نے سیاست مدن سے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے ——— (PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY.) وہ اس میں لکھتا ہے کہ:-

اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے ..... وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا

ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو اُن اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں ـــــ یہ (SOPHOCLES.) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطو نے اس قانون میں جسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لئے اختیار کر لے، اور اُس میں جو تمام نوعِ انسان کے لئے عالمگیر ہو، تفریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ مؤخر الذکر قانون، قانونِ فطرت ہے .... وہ قانون جو اُس وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے۔ اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ :-

> اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔ (ص ۹۵)

اس کے بعد وہ (BLACK STONE) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ :-

> قانونِ فطرت کی اطاعت دنیا کی ہر اطاعت پر مقدم ہے۔ انسانوں کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانونِ فطرت کے خلاف ہو، کبھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔ (ص ۱۰۰)

امریکی پروفیسر (EDWARD CORWIN) نے جو کانسٹی ٹیوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، ایک نہایت مختصر لیکن بڑی پُرمغز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE HIGHER LAW) اس کی بحث و تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد ان اصول و اقدار پر ہونی چاہیئے، جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان و مکان کی حدود سے ناآشنا ہوں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ :-

> یہ نظریہ کہ ممالکِ متحدہ کے آئین کو اس لئے بالادستی (SUPREMACY) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولر وِل) کی پیدا کردہ ہیں، امریکن آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے۔ ابتداء میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور لا ابدی عدل کا تصوّر تھا۔ اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا۔ یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا۔ اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق و صداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر و قیمت کی بناء پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل ہے۔ ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا۔ یہ اصول اگر خود خدا سے قدیم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی رو سے خدا کا ایسا تصوّر سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور باہمدگر مربوط رکھتا ہے۔ یہ اصول موجود فی الخارج ...... اور ازلی ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ (ص ۴)

اس کے بعد کانِدن، مشہور مفکّر (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے کہ :-

> حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا ـــ

غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے' نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے۔ . . . . . نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدل قانون ہے۔ جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صلا)

اس کے بعد وہ (CICERO) کے یہ ناقابل فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ:۔

سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کر دے۔ اس کے علاوہ کوئی قانون بھی ہو اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیئے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ (صلا)

نہ صرف یہ کہ ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیئے۔ (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے (تحفظ کے) لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرمان پذیری کے بجائے بادلِ نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ (صہ۱۶۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے۔ جس کی رو سے ہم پر اس کی اطاعت بہرحال واجب ہو۔ اس کے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیار ان کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ (صہ۱۹۳)

آگے چل کر وہ کہتا ہے:۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب، مشروط ہوتا ہے۔ مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (صہ۲۲)

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ نظام جمہوریت کے تلخ نتائج کا ستایا ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش میں ہے۔ ایک ازلی و ابدی، عالمگیر قانون جس کا سرچشمہ انسانی فکر سے بلند اور ماوراء ہو۔

اس کے بعد مغرب کا یہ مفکرؔ بصد حرمان و یاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے متلاشیانِ حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانینِ فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔ (BARKER, P.100)

مفکرّین مغرب کی دشواری

انسانوں کے خودساختہ قوانین و ضوابط کا ستایا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پہ پاتا ہے جہاں اس زمانے کا انسان تھا جس نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظامِ جمہوریت میں سمجھی تھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمۂ حیات سمجھ کر اس کی طرف لپکا تھا، وہ سراب ثابت ہوا۔ اور چشمۂ حیات، کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش میں وہ اس قدر سرگرداں و حیران اور مضطرب و بیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا تو بتا دیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین جس میں انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی ابدی، زمان و مکان سے ماوراء، عالمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ ایسا قانون انسانوں کا خودساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطۂ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ اسے منزّل من اللّٰہ بالحق کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے اسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو مذہبی پیشوا یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے تم متلاشی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ اس سے ان پر تھیاکریسی کا وہی استبداد پھر مسلط ہو جائے گا، جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس ڈر سے وہ اپنے مطلوبہ ضابطۂ قوانین کو قانونِ فطرت یا فطرتِ انسانی میں مضمر قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دوسری مصیبت یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بیتابی اور دوسری طرف بےبسی اور بےچارگی تھی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار　　عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ:-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسلمانوں کی حالت

مغربی اقوام کی بےبسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمان کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں ہی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے بدترین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبالؔ کے الفاظ میں —

"جہاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر" — ہوتے ہیں۔

محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو (حاکم قوم) کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور

رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے ـــــ وہ قومِ غالب کے ہر نظریہ، مسلک یا نظام کو عرشِ معلّٰے سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجبِ ہزار فخر و مباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لپک کر اٹھاتا اور اپنے لئے خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمال فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام خود اقوامِ مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے۔ اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حقِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سرے سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق

قرآنی نظام

حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے ـــــ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (۱۲/۴۰) قرآن کریم کے اس اوّلین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظامِ جمہوریت خلافِ اسلام قرار پا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصوّر سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت، خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہرحال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے اُس جواب کی حقانیت لکھ کر سامنے آ جاتی ہے جو انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اس کی جگہ اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہندو کے نزدیک بے شک یہ آزادی قرار پا جائے گی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک، جو قرآن کا متبع ہے، یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

کہ قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظامِ حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) بنا بریں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۱۲/۴۰) یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سامنے آجاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہلِ مغرب نے نظامِ جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہاں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے نمائندے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں۔ خدا کی حکومت ہے۔ اس سے تھیاکریسی کا وہ نظامِ حکومت وجود میں آگیا جو ملوکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جا سکتی تھی۔ جس کی نوعیت بہرحال سیاسی سمجھی جاتی تھی۔ خدا کے ان (مزعومہ) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خود خدا کے خلاف بغاوت قرار پا جاتی تھی۔

اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوگا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبانِ نبویؐ سے کہلوایا گیا کہ:۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (6/115)

کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصّل ہے۔

یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تھیاکریسی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی۔ جو ضابطۂ زندگی بن سکتی۔ (انجیل میں قوانین ہیں ہی نہیں) اس لئے جب خدا کی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے بعد لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذاتِ رسالتمآبؐ سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اوّلین حق بہرحال رسول اللہؐ کو پہنچتا تھا۔ جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار پا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت، خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پا گئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار، کفر۔۔۔ سورۃ مائدہ میں ہے:۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5/44)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہؐ سے فرما دیا گیا کہ:۔

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (5/49)

ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

گویا یہاں پھر اسے دہرا دیا کہ یہ حکومت تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآن کریم نے خدا

کے سوا ہر اتھارٹی کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ:-

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ..... (۲/۲۵۶)

جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے انکار کیا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اور اس "کفر بالطاغوت" کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ اور کتبِ سابقہ پر ایمان لے آئے ہیں لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ:-

اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ ۔ (۴/۶۰)

اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے انکار کریں۔

یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور اتھارٹی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصّل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)

خدا کے کلمات (قوانینِ خداوندی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ ضابطۂ خداوندی مفصّل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی۔ (۱۵/۹)

لیجئے! جس قسم کے ضابطۂ حیات کی مفکرینِ مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ وہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مفکرینِ مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ اس قسم کا ضابطہ اور نظام، انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن انہیں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ ضابطہ ملے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آ جائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھا لیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ کیا ہے اسے میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت، خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، محکومی ہے، خواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم اور عوام کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کی رو سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۔ اہل کتاب ہوں یا

مشرکین، کسے باشد، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ ان کے پاس واضح حقیقت نہ آجاتی ـــــ یعنی اللہ کا رسولؐ نہایت پاکیزہ صحائف لے کر ـــــ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (۹۸/۳)

وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ نوعِ انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی تھی۔ اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیریں ٹوٹ سکتی تھیں، جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی اور اسی سے وہ گراں بار سلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ اس بری طرح دبی ہوئی تھی۔ (۱۵۷/۷)

استخلاف فی الارض

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہ استخلاف اُمتِ مسلمہ کو عطا کیا گیا جو ختمِ نبوت کے بعد کتاب اللہ کی وارث تھی۔ سورۂ نور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۵۵/۲۴)

تم میں سے جو لوگ، دین کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے اتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا، یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ استخلاف فی الارض افراد (شخصیتوں) کو نہیں دیا گیا۔ امت کو دیا گیا۔ آپ سوچئے کہ اس انقلابِ عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور افراد کی جگہ اُمتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ روسو کا فلسفہ اور انقلابِ فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن کریم کے تجویز کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، امتِ مسلمہ کے حصے میں آیا۔ اس امت سے کہہ دیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لئے جو عملی پروگرام اور تجویز اور اختیار کیا جائے گا۔ وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کردہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہوگا ـــــ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۳۸/۴۲) یعنے کہ اس نظام کے سربراہِ اوّل، جو بہرحال رسول اللہؐ ہی ہو سکتے، انہیں بھی تاکید کر دی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ (۱۵۹/۳) مملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افرادِ اُمت سے مشورہ کیا کریں۔ ان احکامات کی رُو سے، قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت ـــــ ملوکیت یا آمریت ـــــ کا خاتمہ کر دیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض۔ یعنی نظامِ حکومت، مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ

واجراء۔ سورۃ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجہ میں تمہیں استخلاف فی الارض، حاصل ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کردی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ۔ (۲۴/۵۵) تاکہ اس سے اُس دین کا تمکن ہو جائے (وہ نظام زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے) جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے مملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سندِ قبولیت حاصل ہو، اور اُن سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ چونکہ یہ "تمکن فی الارض" پوری کی پوری امت کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ بھی پوری کی پوری امت کا ہوگا نہ کہ کسی ایک گروہ کا۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۳/۱۰۹)

تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہی اس امت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اوّل حضور نبی اکرمؐ سے۔ (۷/۱۵۷ نیز ۲/۱۴۹)

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی ہے۔ نظامِ مملکتِ اسلامیہ

اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہے

اس کی اطاعت کرانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس نظام میں اپنی اطاعت کوئی بھی نہیں کرا سکتا —— نہ کوئی ایک فرد، نہ افراد کا مجموعہ۔ سورہ آل عمران میں اس حقیقت کو واضح تر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ۔ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا —— خواہ خدا اسے ضابطۂ قوانین یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں، میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے، جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربّانی) بن جاؤ۔

آپ نے پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ نظام جمہوریت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اب یہ دیکھ لیا کہ قرآنی نظام کی عمارت کن اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرما لیجئے کہ کیا مغرب کے

پاکستان اور جمہوریت

جمہوری نظام کو کسی صورت میں بھی اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ اسے اسلامی کہنا تو ایک طرف، وہ اسلام کی نقیض ہے۔ اس کی سند ہے۔ اس میں کہیں خدا نہیں آتا۔ وحی نہیں آتی۔ وحی پر مبنی مستقل اصول نہیں آتے۔ غیر متبدل اقدار نہیں۔ وہ دہریت پر مبنی سیکولر نظام ہوتا ہے۔ اسے اسلام سے کیا واسطہ؟

کہا جائے گا کہ ہم نے اپنے ہاں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ مملکت اپنا کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ ہمارے ہاں کی جمہوریت ان شرائط سے مشروط ہے اس لئے یہ اسلامی ہے۔

لفظی طور پر تو یہ صحیح ہے لیکن عملاً اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مرکزی اسمبلی میں یہ سوال زیر بحث آیا کہ جب کوئی مسودہ قانون پارلیمان کے زیر غور آئے گا تو اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اور حدود اللہ کے اندر مقید ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ تجویز کیا گیا کہ اس کا فیصلہ اسلامی مشاورتی کونسل کرے گی۔ لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ آئین میں اس کونسل کی حیثیت محض مشاورتی رکھی گئی ہے تو اس مقصد کے لئے کسی اور اتھارٹی کی تلاش ہوئی۔ تجویز کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کو اتھارٹی قرار دے دیا جائے۔ ان تجاویز کے جواب میں صدر مملکت نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی تجویز بھی اختیار کی جائے، اس سے پارلیمان کی (SUPREMACY) باقی نہیں رہتی اور یہ چیز اصولِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آئین کو اتنی شرائط سے مشروط کرنے کے باوجود جمہوریت اسلامی نہیں بن سکی۔ اس کا تصور مغربی ہی رہا۔ جس کی رُو سے (SUPREMACY) پارلیمان کے اراکین کی اکثریت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کسی خاص ذہن کا قصور نہیں۔ اس کی وجہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کا بنیادی تصور ہے۔

(DEMOCRACY) میں (DEMO) حکومت (CRACY) یعنی عوام کی ہوتی ہے۔ جس طرح (AUTO-CRACY) میں (AUTO) یعنی ایک شخص کی ہوتی ہے۔ اسلام میں (CRACY) نہ ایک شخص کی ہو سکتی ہے نہ عوام کی۔ اس لئے اسلامی نظام نہ۔ ڈیموکریسی ہو سکتا ہے نہ آٹوکریسی۔ اس میں (CRACY) کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جو دنیا میں کہیں اور موجود نہیں۔ اور تو اور تھیاکریسی کی اصطلاح بھی اس مفہوم کی حامل نہیں اس لئے وہ بھی خلافِ اسلام ہے۔ اسلامی تصورِ حکومت اور نظامِ مملکت بالکل منفرد ہے اس لئے اس کے لئے اصطلاح بھی اپنی اور منفرد ہونی چاہیئے۔ مفہوم کے اعتبار سے اسے ..... (QURANO-CRACY) کہہ لیجئے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔

کیا کیا جائے؟

اس وقت مسلمانوں کے تمام ممالک میں صورتِ حالات کم و بیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی محکومی اختیار کرے، انسانوں کی ہر قسم کی محکومیت سے آزادی حاصل کرے۔ خواہ اس محکومیت کی شکل ملوکیت ہو یا آمریت، اور خواہ عصرِ حاضر کا جمہوری نظام ہو۔ اسے کرنا یہ ہوگا کہ:-

۱- اپنے آئین میں اعلان کرے کہ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہوگا۔

۲- مملکت کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین، اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ واضح رہے کہ قرآنِ مجید بڑی واضح اور مبین کتاب ہے۔ اور اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ غور و فکر کے ساتھ اس کے احکام و اصول کا سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔

۳- یہ بات اُمت (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول و قوانین کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا طریقِ کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلسِ مشاورت کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی۔ اس کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط پاکیزہ زندگی اور قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہوگی۔

۴- یہ سوال پیدا ہوتا رہے گا کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں، یا عام افرادِ معاشرہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ملک کی عدالتِ عالیہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ پارلیمان کا پاس کردہ فلاں قانون آئینِ پاکستان کے مطابق ہے یا نہیں، اس طرح اسی سے یہ بھی دریافت کر لیا جائے کہ فلاں قانون قرآنِ کریم کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ چاہے تو ایسے اربابِ علم و دانش سے مشورہ بھی کرے جن کی قرآنِ کریم پر گہری نظر ہو۔ اس کے بعد عدالتِ عالیہ کا فیصلہ قولِ فیصل تسلیم کر لیا جائے۔

یہ اعتراض کہ اس طرح بالادستی (SUPREMACY) پارلیمان کی نہیں بلکہ عدالتِ عالیہ کی ہو جائے گی، بے معنی ہوگا۔ اس لئے کہ قرآنی نظام میں بالادستی نہ پارلیمان کی ہوتی ہے، نہ کسی اور ادارہ کی۔ اس میں بالادستی کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور ان اداروں کا منصب صرف یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ معاملہ زیرِ نظر میں کتاب اللہ کا حکم کیا ہے۔

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق اس طریق کا مختصر سا خاکہ جس کی رُو سے اس مملکت میں کتاب اللہ کی حاکمیت قائم ہو سکے گی اور اس کے بعد یہاں کے افرادِ معاشرہ بہ ہزار سرفرازی یہ کہہ سکیں گے کہ ہم دنیا میں کسی کے محکوم نہیں۔ ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہے۔ اس تمام تفصیل کو قائدِ اعظمؒ نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع

خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے، اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مملکتِ پاکستان کی حفاظت

آخر میں، میں اتنی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مملکت بھی خدا کی حاکمیت کا اقرار کرے، اس کی سرزمین کی حفاظت مسلمان کا دینی فریضہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ خطۂ زمین محفوظ رہے گا تو خدا کی حاکمیت کے دعویٰ کے عملی صورت اختیار کرنے کا امکان ہوگا لیکن اگر وہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو خدا کی حاکمیت قائم کہاں ہو سکے گی؟ آج کوئی مسلمان اسپین کی سرزمین میں خدا کی حاکمیت کا نام تو لے کر بتائے! اس لئے کوئی اسکیم یا کوئی تحریک، جس کا نتیجہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس خطۂ زمین کی سالمیت کا کمزور ہو جانا ہو، پاکستان اور اسلام دونوں کے خلاف غداری ہے۔ اس کے برعکس مستحق صد مبارک باد ہیں وہ جو اس کی حفاظت کے لئے کوشاں ہوں۔ والسلام

REFERENCES

1. THE INDIVIDUAL, THE STATE & WORLD GOVT. P. 116
2. THE CRISIS OF THE MODERN WORLD ---- P 106
3. SOCIAL JUSTICE ---------- P 161
4. ------ Do ---------- P. 131
5. ------ Do ---------- P. 3
6. ------ Do ---------- P. 9
7. JUSTICE & THE SOCIAL ORDER } QUOTED IN SOCIAL JUSTICE. P. 28

ضروری تصحیح طلوعِ اسلام کے شمارہ جون ۱۹۷۶ء کے صفحہ ۲۸ پر آیت ۶/۱۵ میں "رَبِّیْ" اور "یَوْمٍ عَظِیْمٍ" کے درمیان لفظ "عَذَابَ" غلطی سے رہ گیا ہے۔
یہی غلطی علیحدہ پمفلٹ موسومہ بہ "نظامِ مصطفیٰؐ" کے صفحہ ۲۰ پر بھی ہے۔ قارئین دونوں جگہ تصحیح فرما لیں۔
(ناظم ادارہ)

پاکستان کا ازلی دشمن

(ہماری بدقسمتی سے پاکستان جب بھی نامساعد حالات کے بادلوں میں گھرتا ہے، تو مملکت دشمن عناصر اس قسم کے وسوسے پھیلانے لگ جاتے ہیں کہ ہم خواہ مخواہ ہندوستان سے الگ ہو گئے۔ ہم نے جداگانہ مملکت قائم کر کے کیا کما لیا! ہندوؤں کے ساتھ رہنے میں کیا قباحت تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان وساوس سے ہماری نئی نسل متاثر ہو جاتی ہے اس لئے کہ اسے کبھی ہندو سے واسطہ نہیں پڑا، اور اسے معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد جب اس قسم کے وساوس پھیلائے گئے تو پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۸ء میں ایک حقائق پرور مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا— "ہندو کیا ہے؟"— یہ مقالہ ملک میں بے حد پسند کیا گیا اور اس کی (پمفلٹ کی شکل میں) عام اشاعت کی گئی۔ اس کا نہایت عمدہ اثر پڑا۔

جب ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد، پھر اس قسم کے وساوس پھیلائے گئے تو پرویز صاحب نے ۱۹۷۲ء کے یومِ آزادی کی تقریب پر ایک بصیرت افروز خطاب پیش کیا جس کا عنوان تھا—— ہمارا ازلی دشمن —— اس خطاب کو بھی پمفلٹ کی شکل میں عام کیا گیا جو بڑا مؤثر ثابت ہوا۔

سابقہ ہنگاموں میں پھر اسی قسم کی آوازیں سننے میں آتی رہیں۔ بنابریں ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ حالیہ یومِ آزادی کی تقریب پر اس خطاب کو بنظرِ ثانی ایک بار پھر شائع کیا جائے۔ سو وہ پیشِ خدمت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے ہماری نئی نسل کو بالخصوص معلوم ہو جائے گا کہ ہندو ہمارا کس قدر دشمن ہے اور ہمارے لئے اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنی کس قدر ضروری ہیں)۔

خطاب

جس طرح یہ بات ہماری نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا،

اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتی کہ ہندو ہمارا اس قدر دشمن کیوں ہے؟ پھر جس طرح مطالبۂ پاکستان کے متعلق اسے بالعموم یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے اسباب سیاسی یا بیشتر معاشی تھے، اسی طرح ہندو دشمنی کے متعلق بھی اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ملک کا کوئی حصہ اس سے کٹ کر الگ ہو جائے۔ اگر بعض ناگزیر حالات کے تحت، یہ حصہ ان کے ملک (بھارت) سے الگ ہو گیا ہے تو اس کی انتہائی خواہش ہے کہ یہ پھر کسی نہ کسی طرح اس سے دوبارہ ملحق ہو جائے۔ یہ جزو اپنی اصل سے جا ملے۔ اور جب ہم اپنی نئی نسل کو علیحدگی کے اس قسم کے اسباب بتاتے، اور ان دونوں ملکوں کو پھر سے متحد کرنے کے لئے ہندوؤں کے ان عزائم کا تذکرہ کرتے ہیں تو بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ ہمیں اس علیحدگی کی ضرورت کیا تھی، اور اگر یہ غلطی ہو گئی تھی تو اب اس کا ازالہ کیوں نہیں کر لیا جاتا۔ غلطی پر اڑے رہنا حماقت ہے۔ ہماری نئی نسل اس بحث میں اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ ہم نے انہیں بتایا ہی نہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا صحیح جذبۂ محرکہ کیا تھا، ہندو نے اس کی مخالفت کیوں کی تھی۔ اب وہ دوبارہ اسے یکجا کیوں کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یومِ آزادی (۱۴ راگست) کی تقریب پر، بحالاتِ موجودہ، اس سے معنون تر موضوع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس لئے اپنے آج کے خطاب کے لئے اس موضوع کو ترجیح دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں گذشتہ پچیس چھبیس سال (بلکہ یوں کہیئے کہ ۱۹۳۸ء سے، جب طلوعِ اسلام وجود میں آیا تھا) ان حقائق کو پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن ان کا ایک بار پھر مربوط شکل میں سامنے لانا ازبس ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا تو ساتھ ہی (بذریعہ وحی) کچھ حدود متعین کر دیں اور کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے اختیار کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گا تو معاشرہ کا توازن برقرار رہے گا اور کاروانِ انسانیت، شاداں و فرحاں، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ ان حدود کو اقدارِ خداوندی یا ابدی ضابطۂ حیات کہا جاتا ہے۔ (اور اب یہ قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں) تفصیل ان اقدار و ضوابط کی طویل ہے لیکن منتہیٰ اس کا تکریمِ انسانیت کا تحفظ اور احترامِ آدمیت کا استحکام ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان اقدار و ضوابط سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو، نہ محتاج۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدار و ضوابط، مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گذریں گے۔ ان گروہوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہونے پائے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل یا آویزشِ ابلیس و آدم کہا جاتا ہے۔ یہ کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ بقول اقبالؒ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس کشمکش کی صورت کچھ یوں رہتی ہے کہ جب تک یہ اقدار و اصول، حروف و الفاظ (یعنی

محض معتقدات و نظریات) کی حد تک رہیں، مفاد پرست قوتیں ان سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کرتیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑتا، اگرچہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں کہ ان کی تبلیغ و اشاعت سے یہ عملی پیکر نہ اختیار کرنے پائیں۔ یہ جو سیکولر حکومتیں مذہبی آزادی دیتی ہیں تو اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن جب اور جہاں یہ نظریات عملی صورت اختیار کرنے لگیں۔ یہ انہیں کچلنے کی انتہائی کوشش کرتی ہیں اور میدانِ جنگ تک میں اتر آتی ہیں۔ حضرات انبیاء کرامؑ کا مشن یہ تھا کہ وہ ان اقدار و اصول کی تبلیغ اور اشاعت سے ایک جماعت متشکل کریں، جو انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار ہو جائے تاکہ نوعِ انسان استبدادی قوتوں کی گرفت سے مخلصی حاصل کرے۔ مفاد پرست گروہوں نے ان جماعتوں کی مخالفت کس کس انداز سے کی، قرآن کریم نے اسے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اقوامِ سابقہ سے آگے بڑھ کر جب ہم اس دور میں آ جاتے ہیں جب ان اصول و اقدار کو آخری اور مکمل شکل میں عطا کیا گیا اور خدا کے آخری رسول، حضور نبی اکرمؐ کے زیرِ لوا قدوسیوں کی اس جماعتؓ نے جس پر خدا اور ملائکہ تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے تھے، انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تو مفاد پرست گروہوں نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی۔ تاریخ کے اوراق اس کی زندہ شہادت ہیں۔ حضورؐ کی مکی زندگی، ان اقدار و اصولات کی نشر و اشاعت اور ان کی بنیادوں پر تشکیلِ جماعت کا ابتدائی دور تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اگرچہ انفرادی طور پر اذیت رسانیوں اور صعوبات انگیزیوں کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ لیکن مفاد پرست گروہوں نے منظم طور پر ان کی مخالفت میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لیکن جونہی اس پروگرام کا دوسرا دور شروع ہوا جسے مدنی زندگی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس میں ایسی مملکت کی بنیاد رکھی گئی جس میں ان اقدار نے قانون کی حیثیت سے نافذ ہونا تھا، ان قوتوں نے منظم مخالفت شروع کر دی اور مسلسل سات آٹھ برس تک اپنی یورشوں کا سلسلہ جاری رکھا تا آنکہ انہیں ہار تھک کر سپر انداز ہونا پڑا۔

اس دورِ ہمایوں کے بعد وہ مملکت نہ رہی جس میں ان اقدار و ضوابط کو قوانینِ حکومت کی شکل میں نفاذ پذیر ہونا تھا۔ اب ان کی حیثیت محض نظری یا رسمی رہ گئی۔ اب مفاد پرست گروہوں کو ان سے چنداں خطرہ نہ رہا۔ اس لئے انہوں نے منظم طور پر ان سے تعرض نہ کیا۔ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) سیکولر حکومتوں میں جس مذہبی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ان اصول و اقدار کی وعظ و نصیحت کی صورت میں تبلیغ کی جائے اور بعض کی رسمی طور پر ادائیگی کر لی جائے۔

اس صدی کے شروع میں، علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد

تحریکِ پاکستان

دلائی کہ جسے مذہبی آزادی کہا جاتا ہے وہ دین کے اصولات و اقدار کی نظری تبلیغ کی اجازت اور رسومات کی ادائیگی سے عدم تعرض ہے۔ یہ دین کی آزادی نہیں۔

وہ اس فرق کو مسلسل بیان کرتے چلے گئے۔ مسلمانوں میں سے بہت کم لوگوں نے اس فرق کو سمجھا لیکن ہندوؤں کے اکثر و بیشتر دانشوروں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ اقبالؒ کے اس پیغام کا منتہیٰ کیا ہوگا۔ چونکہ وہ زمانہ انگریز کی حکومت کا تھا، اس لئے ہندوؤں کی طرف سے اسلام کے اس فلسفۂ زندگی کی جارحانہ مخالفت ممکن نہ تھی۔ بنابریں انہوں نے اس آنے والے خطرہ کی روک تھام کے لئے کہ ہندوستان میں اسلام، کہیں عملاً دین کی شکل اختیار نہ کر جائے، تنظیمی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں۔ سنگھٹن (یعنی ہندوؤں کا منظم اتحاد) اور شدھی (مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب سے ہندو بنانے) کی تحریکیں انہی تدابیر کی عملی تعبیریں تھیں۔ اس زمانے میں لالہ ہردیال، ہندوؤں کا ایک مشہور جوشیلا لیڈر تھا۔ اس نے ان تحریکوں کو عام کرنے کے لئے منظم پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۲۴ء میں اخبار تیج کے کرشن نمبر میں شائع ہوا تھا لکھا تھا:-

سنگھٹن اور شدھی

ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک متحد اور گرد و پیش سے باخبر، فعال سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے جو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد کر سکے۔ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے (پاک کر کے) ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔

لالہ ہردیال نے اپنے ایک اور مضمون میں جو روزنامہ تیج "دہلی" کی ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھا:-

ہندو سنگھٹن کے لئے ہندو سوراجیہ (حکومت) کا آدرش (نصب العین) ضروری ہے۔ پنجاب میں ہندو سوراجیہ قائم کرنے کے آدرش ہی سے لوگوں میں قربانی کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندو سنگھٹن کا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ جب تک ہندوستان بالخصوص پنجاب، بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہوگا ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے، بے جان ہے، مُردہ دل ہے، بے سمجھ ہے۔ اس نے ہندوؤں کو مزید مشتعل کرنے کے لئے لکھا: "پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں نہیں رہ سکتیں یا سب ہندو اسلام قبول کر لیں یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے، اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو، یا

اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فی صد اسلام سے صرف بلوہ فساد ہوں گے۔ بیس فی صد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا۔ پس اسلام کی تاریخ اور مزاج کو جان کر ہمیں ہندو اتحاد کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اب تو صرف ذاتی طور پر شدھی کرنی چاہیئے، سوراج ملنے پر ریاست کی مدد سے شدھی کی تحریک کو ترقی دینی چاہیئے"

لالہ ہردیال اپنی اس تحریک کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان کو بھی ہندو دائرے کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا:۔

افغانستان کوئی جدا ملک نہیں۔ یہ ہندوستان، پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مورتیاں، مُت اور مندروں کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں۔ جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ہند سے ظاہر ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت دکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دکھ کا اندیشہ صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ پہاڑی لوگ اسلام کے پیرو اور مسلمان ہیں۔ مگر جب ہم ان کو ہندو بنا لیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ لہٰذا افغان اور سرحدی مسلمانوں کو ہندو بنا دینا ہمارا بہت ضروری فرض ہے۔ تمام ہندو قوم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندو کے سامنے یہ تین اصول ہر وقت رہنے ضروری ہیں۔ ایک تو ہندو سوراج۔ دوسرے ہندوستان کے سب مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا۔ تیسرے افغانستان اور سرحد کو فتح کرنا اور وہاں کے باشندوں کو ہندو بنانا۔

اس کے بعد وہ افغانستان سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ:۔

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر بھی قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ پس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کی شدھی، افغانستان کی فتح، وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔ (اخبار ملاپ ۳۰ اجون ۱۹۲۵ء)

اُسی زمانے میں ہندوؤں کے ایک اور مشہور لیڈر، سوامی ستیا دیو نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:۔

جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے۔

(۱) قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔

(۲) محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔

(۳) مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔

(۴) سعدی اور رومی کی بجائے کبیرؔ اور تلسی داس کو پڑھو۔

(۵) اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔

(۶) وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔

(اخبار الوکیل - امرتسر - ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء)

اور پروفیسر رام دیو نے تو واضح تر الفاظ میں کہہ دیا کہ :۔

ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

(اخبار گرو گھنٹال - ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء)

آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ اس سے واضح ہے کہ سوراجیہ (یعنی آزادیٔ ہند) کی تحریک سیاسی نہیں تھی بلکہ یکسر مذہبی تحریک تھی۔ بہرحال، ہندو لیڈر موقع بے موقع اپنے ان عزائم کا اظہار کرتے رہے اور دوسری طرف علامہ اقبالؒ، ان بیانات سے کوئی اثر لئے اور مشتعل ہوئے بغیر اپنا پیغام عام کرتے رہے کہ اسلام ایک زندہ حقیقت اُسی صورت میں بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت ہو۔ انہیں مشتعل ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ ان کے اس پیغام کا جذبۂ محرکہ، ہندوؤں کے خلاف منتقمانہ نہیں تھا۔ یہ قرآن کریم کا تقاضا اور دین کی اصل و بنیاد تھی؛ اس لئے وہ اسے دینی حقیقت کے طور پر پیش کرتے تھے نہ کہ کسی ردِّ عمل کے طور پر۔ وہ اس پیغام کو عام کرتے چلے گئے۔ تا آنکہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت میں اسے ایک متعین شکل میں قوم کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا :۔

اقبالؒ کا خطبۂ صدارت

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اُسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ــــ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیانی ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ ...... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے ...... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

مسلمانوں نے تو اس وقت اس سکیم کو محض ایک شاعر کا خواب سمجھا لیکن ہندو بھانپ گیا کہ ہوا کا رُخ کس سمت کو ہے۔ چنانچہ اس نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنی پہلی اسکیم۔ یعنی

مسلمانوں کو شدھ کر کے ہندو بنانے کی اسکیم ترک کر دینی چاہیئے اور اس کے بجائے ایسا دائم ہم لنگ زمین بچھانا چاہیئے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایک طرف اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے جب مذہب کی بنیادوں پر مملکتوں کا قیام عمل میں لایا جاتا تھا اور دوسری طرف اس پروپیگنڈہ کو عام کیا کہ آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں ہندو راج قائم نہیں کیا جائے گا — جمہوری انداز کی حکومت ہوگی جس میں پوری کی پوری ہندوستانی قوم (یعنی ہندو مسلمان وغیرہ) ایک قوم کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ اور نظامِ حکومت سیکولر ہوگا۔ آپ نے غور کیا کہ یہ صرف الفاظ کا فرق تھا۔ نصب العین پیشِ نظر وہی پہلے کا تھا۔ جمہوری اندازِ حکومت میں حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور ہندوستان میں ہندو، اتنی عظیم اکثریت میں تھے کہ وہ کبھی اقلیت میں تبدیل ہو ہی نہیں سکتے تھے، نہ ہی مسلمان اکثریت میں آ سکتے تھے۔ لہٰذا عملاً حکومت ہندوؤں ہی کی رہتی تھی۔ جہاں تک سیکولر نظام کا تعلق ہے، اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ یا شخصی قوانین کی حد تک مذہبی آزادی ہو اور تمدنی قوانین اکثریت (یعنی ہندوؤں) کے وضع کردہ ہوں۔

سیکولرازم کی تحریک

جہاں تک اسلام کی بنیادوں پر ایک جداگانہ مملکت کے قیام کا سوال تھا، ہندوؤں نے اس کی مخالفت میں اپنے پروپیگنڈہ کی مہم کو تیز تر کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ:-

> جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل نہایت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (میری کہانی۔ صفحہ ۱۷۱)

ظاہر ہے کہ "منظم مذہب" سے پنڈت جی کا اشارہ اسلام ہی کی طرف تھا۔ کانگریس کے دوسرے مشہور لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوانِ اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا کہ:-

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر، ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۹۳۸-۹-۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:-

> حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں،

یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمے دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز - ۲۹-۱۱-۱۴)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا:-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے...... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن - ۱۹۴۶-۱۲-۹)

انہوں نے دوسرے مقام پر کہا:-

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں۔ اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز ۴۰-۶-۹)

میں نے برادرانِ عزیز! بات یہاں سے شروع کی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل، سیاسی یا معاشی نہیں تھے۔ اس اختلاف کی بنیاد مذہب پر تھی۔ مسلمانوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اس دین کی صورت میں رائج کیا جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں نافذ العمل تھا اور جس سے مقصود یہ تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ کو خدا کی عطا کردہ راہنمائی کے مطابق طے کیا جائے اور اقدارِ خداوندی کو اس طرح عملی شکل دی جائے کہ اس سے تمام افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا جائیں اور اس طرح کاروانِ انسانیت اس نصب العین کی طرف بڑھتا چلا جائے جو خالقِ کائنات نے اس کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ پروگرام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن تھا۔ ہندو اوّل تو اسے (مذہب اسلام کو) مٹا ہی دینا چاہتا تھا جس کا طریق کار اس کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب سے ہندو بنا لیا جائے اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے تو پھر انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یعنی یہ کہ اسلام کو ایک پرائیویٹ مذہب کی حیثیت سے زندہ رہنے کی اجازت دی جائے اور مذہب بھی ایسا جسے ہندو مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے جو تعلیمی اسکیم مرتب کرائی تھی (جسے واردھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا تھا) اُسے متعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ:-

میں اس بات کو سختی سے مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ اُن کا مذہب

دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔
(ہندوستان ٹائمز ۱۹۳۸ - ۷ - ۱۷)

ہندو لیڈر ان خیالات کا عام پرچار کرتے تھے۔ دوسری طرف علامہ اقبالؒ اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کئے جاتے تھے۔ وہ اس پیغامِ خداوندی کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک عام کرتے رہے (اسی کی نشر و اشاعت کے لئے اپریل ۱۹۳۷ء میں طلوعِ اسلام کا وجود عمل میں لایا گیا تھا) اس کے بعد یہ شمع قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ میں آئی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ انہوں نے ہندوؤں کے خلاف جو جنگ لڑی تھی۔ اس کی بنیاد (عام اصطلاح میں) سیاسی یا معاشی تھی یا وہ حق و باطل کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے چلی آ رہی تھی۔ جس نے انتہائی شدت خدا کے آخری رسول نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے دور ہمایوں میں اختیار کر لی تھی اور جس کی صدائے بازگشت علامہ اقبالؒ کے پیغامِ حیات آفریں میں سنائی دی تھی اور جس کا نقیب طلوعِ اسلام تھا۔

جب قائدِ اعظمؒ نے اعلان کیا کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اسلام کا تقاضا ہے تو اس پر مسٹر گاندھی نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا جس میں کہا کہ:-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب بہت بڑا عنصر ہے لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے؟ وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ) آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پسندی بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔
(تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد اوّل - ۴۰ - ۱۳۹)

آپ نے اس خط سے دیکھا کہ مسٹر گاندھی اپنے لئے سیاست کا جذبۂ محرکہ قرار دیتے تھے لیکن جب مسلمان اپنے سیاسی مطالبہ کی بنیاد اسلام ٹھہراتے تھے تو مسٹر گاندھی اعتراض کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ! ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندو لیڈر برملا اعلان کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ہندو دھرم کا راج قائم ہوگا۔ کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا تھا کہ وہ لوگ متشدد قسم کے ہندو ہیں۔ کانگریس کا یہ نصب العین نہیں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات غیر شعوری طور پر ان کی زبان پر بھی ایسی ایسی باتیں آ جاتی تھیں جن سے واضح ہو جاتا تھا کہ یہ نصب العین متعصب ہندوؤں ہی کا نہیں تھا، خود کانگریس اور مسٹر گاندھی کا بھی یہی مقصد تھا۔ مثلاً اس زمانے کی کانگریس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ

کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ:-

ہندو فلسفۂ حیات

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دیں، بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگرس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

ہندوؤں کی بالعموم اور مسٹر گاندھی کی بالخصوص یہی دو رُخی پالیسی تھی جس کے پیشِ نظر قائدِ اعظمؒ کو جھنجھلا کر کہنا پڑا تھا کہ:-

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے (اور یہ کہ) مشکل یہ کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا حقیقی مقصد ہوتا ہے، اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

اور مذہب و سیاست کے متعلق ہندو کی یہی دو رنگی تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

نگہ دارد برہمن کارِ خود را　　نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر　　بدوشِ خود بُرد زنّارِ خود را

ہندوؤں کے برعکس قائدِ اعظمؒ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں واضح الفاظ میں اعلان کرتے تھے کہ ہمارا مطالبہ خالص دین پر مبنی ہے اور وہ مطالبہ ایک ایسی آزاد اور جداگانہ مملکت کا قیام ہے جس میں اسلام ایک عملی حقیقت بن کر سامنے آئے۔ میں ان کے بیانات اور تقاریر کو گذشتہ ستائیس سال سے مسلسل دہراتا چلا آ رہا ہوں بایں ہمہ ان کی اہمیت اور وقت کا تقاضا ہے کہ ان میں سے چند ایک، ایک بار پھر قوم کے سامنے پیش کر دی جائیں تاکہ اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے کہ مملکتِ پاکستان کا مطالبہ خالص دینی بنیادوں پر تھا۔ مثلاً انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

قائدِ اعظم کے ارشادات

ا۔ مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات، اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریر حصہ دوم - صفحہ ۳۳۳)

۲۔ انہوں نے ۲ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج پشاور کے طلبہ کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے آئیڈیل کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندو لیڈر شپ رام راج قائم کرنا چاہتی ہے اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی۔

۳۔ انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو ریڈیو پر قوم کے نام پیغامِ عید نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا:۔

معاشی انصاف ہو یا سیاسی آزادی، اسے آخرالامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور روحِ اسلام ہے۔

(تقاریر جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

۴۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ر مارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اب اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات، اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔ (تقاریر۔ جلد دوم صفحہ ۴۵۵)

۵۔ انہوں نے اسی حقیقت کو دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے ایسے مختصر، جامع اور دو ٹوک الفاظ میں واشگاف کیا کہ جن کے بعد اس سلسلے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔

(تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ نمبر ۲۶۷)

۶۔ پھر انہوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو پاکستان ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برِّصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۵)

کتنی عظیم حقیقت ہے جسے اس سوز و گداز سے زبان پر لایا گیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا اور ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا تھا؟ اس

سلسلے میں ایک لفظ اور بھی وضاحت طلب ہے۔ ان تقاریر میں قائداعظمؒ نے بار بار اسلام کا نام لیا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی اور پھر ایک اعلیٰ پایہ کا قانون دان ہونے کی جہت سے بھی، وہ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اسلام کا لفظ ایسا وسیع المعنی ہو چکا ہے کہ ہر شخص اور ہر فرقہ اس کا الگ الگ مفہوم لیتا ہے۔ اس بنا پر وہ جانتے تھے کہ جب اسلام کو مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرار پانا ہے تو اسلام کا بنیادی مفہوم متعین ہونا چاہیئے چنانچہ انہوں نے مختلف مواقع پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس مملکت کی بنیاد خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم پر ہوگی۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں فرمایا:۔

قرآن کریم بطور ضابطۂ حیات

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کونسی چٹان ہے جس پر اُن کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، لہٰذا ایک قوم۔

(تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۵۰)

قائداعظمؒ نے اس بنیادی حقیقت کو اس طرح بار بار دہرایا کہ مطالبۂ پاکستان کے مخالفین کو اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام نہیں رہا تھا۔ یکم نومبر ۱۹۴۴ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور راہنما، مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ:۔

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ ذرا معلوم تو کر لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرزِ حکومت، قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی

زبان بن سکے ، مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی ۔ (ٹریبیون ۔ ۱۹۴۱ ۔ ۱۱ ۔ ۲)

اور یہی تھی ہندوؤں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ ۔ یہ مخالفت ، نہ سیاسی تھی ، نہ ——— معاشی (طلوعِ عکرتاً ہی سہی) ہندو اسے تو گوارا کر سکتا تھا کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے باقی رہ جائے لیکن وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک دین کی شکل اختیار کرے ۔ خواہ وہ ایک جداگانہ مملکت کی حدود کے اندر ہی کیوں نہ ہو ۔ وہی وجۂ مخالفت جس کی بنا پہ مکہ کے قریش یہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ مسلمانوں کی قرآنی حکومت قائم ہو جائے ، خواہ وہ مدینہ میں ہی کیوں نہ ہو ۔

لیکن ہندوؤں کی شدید ترین مخالفت کے باوجود پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا ۔ اُس وقت ہندوؤں کی قلبی کیفیت کیا تھی ؟ اس کا اندازہ اس کہرام سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اس وقت مچایا ۔ ہندو مہا سبھا کے (اُس زمانہ کے) صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے جولائی ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا کہ :-

تقسیم ہند کے وقت

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے ۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے ، یا اس کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑیں ۔ (آرگنائزر ۔ مورخہ ۴۷ ۔ ۷ ۔ ۳)

دیوان چمن لال کا شمار ہندوؤں کے اعتدال پسند طبقہ میں کیا جاتا تھا ۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھائی تھی کہ :-

میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں ۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے ۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے ۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں ۔ (ایضاً)

پاکستان ، انگریز ، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا ۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا :-

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا ۔

اس مقام پہ میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کش مکش کیا تھی ۔ کانگریس کا دعویٰ یہ تھا کہ

اب سیکولر نظامِ حکومت کا قلعہ آچکا ہے جس کی رُو سے ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے ایک قوم شمار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کا اپنا نظام ہے جس کی رُو سے ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں قرار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ اسلام کے اس تقاضے کی بنیاد پر ہے۔ کانگریس کے مذکورہ بالا ریزولیشن میں آپ نے دیکھا کہ انہوں نے اسلام کے اس نظریہ کو باطل اور مردود قرار دیا تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اس ساری کشمکش کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر تھی۔

بہرحال تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا۔ اس فیصلے پر کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو نے دستخط کئے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف قوم سے کہہ رہے تھے:۔

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔
>
> (PAKISTAN FACES INDIA, PAGE-99)

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میرے اس خطاب کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی اس مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں اس پر تو اعتراض نہیں تھا کہ مسلمان اسلام پر ایک مذہب کی حیثیت سے عمل پیرا رہیں۔ لیکن وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات یعنی دین کی شکل اختیار کر جائے خواہ وہ کسی الگ خطۂ زمین ہی میں کیوں نہ ہو۔ دیکھئے کہ تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں نے اپنے اس جذبہ کا اظہار کن الفاظ میں کیا تھا؟ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ:۔

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:۔

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۲۵-۱۰-۴۸)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ :-

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی سٹیٹ ہوگا..... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہندو اس پر رضامند تھا کہ مسلمان اپنی الگ مملکت بے شک قائم رکھیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس میں سیکولر نظام رائج کریں۔ یعنی وہ اسلام پر مذہب کی حیثیت سے کاربند رہیں۔ انہیں اعتراض اس پر تھا کہ پاکستان کو اسلامک اسٹیٹ بنایا جائے اور یہی وہ اختلاف کی بنیاد تھی جس کی وجہ سے وہ پاکستان کے جداگانہ وجود کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ (مثلاً) راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ :-

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت - ۵ - ۱۲ - ۲۱)

یہ تو ۱۹۵۰ء کی بات ہے، بھارت کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے اسی زمانے میں یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ "ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔" بھارت نے اپنے اس فیصلہ پر عمل درآمد ۱۹۶۵ء میں کیا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس جنگ میں وہ اپنے مذموم عزائم میں ناکام رہا ——— ہندوستان اور خود پاکستان کی طرف سے اس جنگ کی مختلف توجیہات بیان کی گئیں اور کی جاتی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ درست ہو سکتی ہیں لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ تھی جو میرے اس عتاب کا عمودی نکتہ ہے اور جسے ہندوستان کے اس زمانے کے وزیر دفاع مسٹر چوّن نے بیان کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ :-

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوستان اور پاکستان میں بنائے نزاع کیا ہے۔ سیاسی یا معاشی نہیں نظریہ کا اختلاف اور یہی وہ نظریاتی اختلاف ہے جسے مٹانے کے لئے مسٹر چوّن نے ۱۹۶۵ء میں کہا تھا کہ بھارت کو اس کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرنی چاہیئے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ

اور یہ جنگ اس نے ۱۹۷۱ء میں کی اور اس کے لئے میدانِ کارزار مشرقی بنگال کا منتخب کیا۔ یہ اس لئے کہ وہ خطۂ زمین اس نظریاتی اختلاف میں بھارت کا ہمنوا ہو چکا تھا۔ اس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پاکستان کے متعلق وہاں کی وزیرِاعظم، مسز اندرا گاندھی کے دل میں چھپے ہوئے جذبات کیا تھے۔ اُس نے سالہا سال تک ان جذبات کو اپنی زبان تک نہ آنے دیا۔ اس نے برسہا برس تک ان جذبات کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور سقوطِ ڈھاکہ سے ذرا پہلے اس نے ان کا اظہار کیا۔ اس نے نومبر ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

> میرے پتا، پنڈت نہرو تحریکِ آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔ وہ میرے سب کچھ تھے۔ وہ میرے شفیق باپ بھی تھے، استاد بھی، اور راہ نما بھی۔ یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن بھارت کی تاریخ ان کے اور ان کی جماعت، انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بھیانک جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ جرم ہے بھارت کی تقسیم۔ انہوں نے سردار پٹیل اور ہندو مہاسبھا کے دباؤ میں آکر ایک ایسا فیصلہ قبول کر لیا جس نے بھارت ماتا کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات مجھے بڑے دکھ سے کہنی پڑ رہی ہے اس لئے کہ وہ میرے پتا تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ بھارت کے ہر دلعزیز رہنما بھی تھے۔ آج مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے تو میں ان کی بیٹی سے زیادہ، بھارت کی وزیرِاعظم کی حیثیت سے بھی بات کر رہی ہوں۔ میں یہ بات نہ بھی کہوں تو بھارت کی موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں یہی کہتی رہیں گی۔ وہ پنڈت نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ (بحوالہ مشرق، ۷۲-۴-۷)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے مسز اندرا گاندھی نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا؟ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا ہے۔ اس نے کہا یہ تھا کہ:-

> یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے۔ حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس کشمکش کی بنیاد، نہ سیاسی ہے نہ معاشی۔ یہ خالصتاً نظریاتی ہے اور نظریاتی یہ کہ ہندو چاہتا ہے کہ مسلمان اسلام پر کاربند رہنا چاہتے ہیں تو اس پر مذہبی حیثیت سے کاربند رہیں، دین کی حیثیت سے نہیں۔ یعنی اپنے ہاں سیکولر نظامِ حکومت

رائج کریں۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے لئے ہندو نے مشرقی پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہاں کے سرکردہ حضرات بالعموم نظریاتی طور پر ہندو کے ہمنوا ہو چکے تھے۔ چنانچہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب مسز اندرا گاندھی وہ کچھ کہہ رہی تھیں، تو دوسری طرف اس زمانے میں بنگلہ دیش کے قائم مقام صدر، مسٹر نذرالاسلام یہ فرما رہے تھے:۔

ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں، اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بناء پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

خود مجیب الرحمٰن نے پاکستان سے رہا ہونے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے پر کہا کہ:۔

میری قوم، سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر توافق کیوں ہے۔ اس کا جواب صاف اور واضح ہے کہ ہم دونوں کے نصب العین، زاویۂ نگاہ، اور افکارِ حیات ایک ہیں۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۷۲ء)

ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۳۰ر جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجۂ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس طلسم کی قلعی کھول دی اور نظریۂ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوشنمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پرور طبقہ۔ اس شدّ و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی ۲۷ر فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچئے

کہ بلوچ، پٹھان اور پنجابیوں کو کونسا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

وقت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے میں، عزیزانِ من! اس داستان کو طول نہیں دینا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ پاکستان کے ساتھ ہندوؤں کی مخالفت کی بنیاد نہ سیاسی ہے نہ معاشی، اس کی بنیاد نظریاتی ہے۔ یعنی ہندو، صرف اُس وقت، پاکستان کی مخالفت چھوڑ سکتا ہے (بشرطیکہ اس میں دیگر وجوہات حائل نہ ہوں) جب یہ اپنے اسلامی نظریہ کو چھوڑ کر سیکولرازم کا نظریہ اختیار کرے۔ مسلمانوں میں سے جس نے بھی سیکولرازم کے نظریہ کی حمایت کی (خواہ وہ تقسیمِ ہند سے پہلے تھا یا بعد) ہندوؤں نے اُسے اپنا سمجھا۔ جس نے ایسا نہیں کیا اُسے وہ اس وقت بھی اپنا دشمن سمجھتے تھے اور آج بھی اُسی طرح دشمن سمجھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہم اس وقت تک اس مملکت میں اسلام کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل نہیں کر سکے لیکن اگر یہ خطۂ زمین محفوظ رہے تو اس کا امکان باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر (خدانخواستہ) یہ خطۂ زمین ہی باقی نہ رہا تو ——— اس کے بعد میں سوائے اس کے کہ ایک آہِ جگر گداز کے ساتھ، قائداعظمؒ کے ان الفاظ کو دہرا دوں جو انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران ارشاد فرمائے تھے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

ہماری نجات، حفاظت اور عزت آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جد و جہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

اُس دن ہندوؤں کے گھر گھی کے چراغ جلیں گے۔ خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھائے۔

والسلام

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسئے نہیں، یہ کتاب دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز انتہا دلکش اور بہکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ، عمدہ کاغذ، مجلد، تین جلدیں۔ قیمت فی جلد -/۱۲ روپے۔

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت جلی ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ چار جلدیں۔ قیمت فی جلد -/۲۵ روپے

ملنے کا پتہ (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ (۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء

بزمِ مذاکرہ

(قسط ششم)

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء کی مجلسِ مذاکرہ کی تقاریر بالاقساط شائع ہو رہی ہیں — پانچویں قسط، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب چھٹی قسط پیشِ خدمت ہے۔)

۱۴۔ فرزانہ پرویز

میرے بزرگو! بہنوں اور بھائیو!۔

مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کے لئے کسی کمیٹی یا کمیشن بٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں مذہب کے نام سے جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کے دو چار ورق الٹئے حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ میں انہی دو چار اوراق کو آپ کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔

کسی قوم کے عروج ہی کا نہیں اس کی بقاء کا راز اس میں پنہاں ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد قانون کی پابندی کس حد تک کرتے ہیں۔ قانون کی پابندی اس سزا کے خوف کی وجہ سے کی جاتی ہے جو اُس قانون کے توڑنے سے ملتی ہے۔ اگر اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ قانون توڑنے سے سزا نہیں ملے گی تو کوئی بھی قانون کی پابندی نہیں کرے گا۔ معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں گے اور جس قوم میں جرائم عام ہو جائیں نہ صرف یہ کہ اس پر زوال آ جائے گا۔ بلکہ اس کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔

جس چیز کو ملکی اصطلاح میں جرم کہا جاتا ہے۔ مذہب کی اصطلاح میں اُسے گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے دل میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ تم جتنے گناہ جی چاہے کرو ان کی سزا نہیں ملے گی تو ظاہر ہے کہ اس قوم میں گناہ یعنی جرائم عام ہو جائیں گے۔ اور وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ہمارے ہاں گناہوں کی سزا سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر بتائی جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ ان تدابیر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی ہیں حالانکہ ان کے وضعی ہونے کا

بین ثبوت یہ ہے کہ خود حضورؐ نے فرمایا کہ اگر بہ فرضِ محال میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اور آپ نے خود اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ بیٹی! خدا کے ہاں تمہیں محمدؐ کی بیٹی ہونا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ وہاں تمہارے اعمال دیکھے جائیں گے۔

بہرحال آئیے! ہم دیکھیں کہ ہمارے ہاں گناہوں کی سزا سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر بتائی جاتی ہیں۔

(۱) ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو اُن کے جدا ہونے سے پہلے اللہ انہیں بخش دیتا ہے۔ یعنی! تمام جرائم کی سزا سے معافی مل گئی۔

(۲) روایت میں ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔

(۳) روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو۔ یعنی جہنمیوں والے کام کرتے رہتے ہو لیکن جب تم صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ اُس آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ پھر ظہر تک ویسے ہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ پھر عصر تک وہی کام کرتے ہو لیکن عصر کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اگر تم رات کو بھی دوزخیوں جیسے کام کرو تو فجر کی نماز انہیں مٹا دیتی ہے۔

(۴) ایک روایت میں ہے کہ جو شخص فرضوں کے علاوہ دن رات میں بارہ رکعت نفل پڑھ لے اس کے لئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

(۵) ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے جمعہ کے خطبہ کو خاموشی کے ساتھ سنا اُس کے نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

(۶) ایک حدیث میں ہے کہ نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا اگر دوسری نماز سے پہلے مر جائے تو وہ جنت میں جائے گا۔

(۷) ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے دن میں سو بار قُلْ هُوَ اللّٰه پڑھ لیا اس کے پچاس سال کے گناہ مٹ جائیں گے۔

(۸) ایک حدیث میں ہے کہ رمضان کی ہر رات چھ لاکھ دوزخی آزاد کئے جاتے ہیں۔ اور رمضان کی آخری شب تمام گزشتہ تعداد کی مثل دوزخ سے آزاد کئے جاتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح محرّم کی دسویں کا روزہ رکھنے سے بھی ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

(۹) ایک روایت میں ہے کہ بخار اور دردِ سر سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن کا بخار بھی تمام گناہوں کو دُور کر دیتا ہے۔

(۱۰) ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر کسی میت کی نمازِ جنازہ میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ اگر کسی میت کو چار یا تین یا دو آدمی بھی اچھا کہہ دیں تو خدا اُسے بخش دیتا ہے۔

یہ تو ہوئے جرائم کی سزا کی معافی کے طریق۔ اسلام میں شہید کا درجہ سب سے بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دین کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ شہید سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ وہ سیدھا جنت میں چلا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اس قسم کی روایات کی رُو سے درجہ شہادت بھی کس قدر آسان اور عام کر دیا گیا۔ مسلم کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو۔

حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس طرح تو میری اُمت میں شہیدوں کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا۔ جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید۔ جو طاعون سے مر گیا وہ شہید۔ جو دست آنے سے مر گیا وہ شہید۔ جو مکان کے نیچے دب کر مر گیا وہ شہید۔ جو نمونیہ سے مر گیا وہ شہید۔ جو آگ میں جل کر مر گیا وہ شہید۔ جو ڈوب کر مر گیا وہ بھی شہید۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شہادت کس قدر عام ہو گئی۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ شہید اکیلا ہی جنت میں جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے عزیز رشتہ داروں میں سے ستّر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

سوچئے! میرے بزرگو، اور بہنو! کہ جس قوم کو ہزار برس سے یہ سبق پڑھایا جا رہا ہو اُس میں جرائم کے عام ہونے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس میں کچھ کسر رہ گئی ہے تو اُسے مسلم کی ایک حدیث نے یہ کہہ کر پورا کر دیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:-

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے مٹا دے گا۔ اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ جس کا شیوہ یہ ہو کہ خوب گناہ کرے اور پھر خدا سے بخشش طلب کرے۔

فرمایئے بزرگانِ من! کہ اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم پر زوال کیوں آ گیا ہے؟ زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں۔ زوال کی وجہ یہ مذہبی تعلیم ہے کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہمیں کسی جرم کی سزا نہیں ملے گی۔ اگر ہم نے گناہ کرنے چھوڑ دیئے تو خدا ہمیں مٹا دے گا اور ہماری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو جی بھر کر گناہ کرے گی۔ لہٰذا ہمارے ہاں جو لوگ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں ہمیں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اُن کے جرائم کے صدقے میں ہم مٹنے سے بچے ہوئے ہیں۔

والسلام

۱۵۔ نجمہ صفدر

میرے بزرگو۔ بھائیو اور بہنو۔ سلام و رحمت!

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں جو فلسفہ بیان کیا ہے، اُسے میں اپنی چھوٹی بہن کے لئے چھوڑتی ہوں کہ فلسفیانہ باتیں وہی کیا کرتی ہے۔ میں تو سیدھی سادی طالبہ ہوں جو پانی کو پانی کہتی ہوں۔ "علّتُ الاولیٰ خیالات" نہیں کہتی۔ حضرتِ علامہ نے ایک بات تو یقینی طور پر کہہ دی ہے کہ: ع

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

بے زری سے مراد غریبی اور مفلسی ہے۔ باقی رہا "بندۂ مومن" سو اس سے اُن کی مراد ہم مسلمان ہیں۔ قرآنی معیار کا مومن نہیں! کیونکہ مومن پر تو زوال آ ہی نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے خود اس کی شہادت دی ہے جو کہا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم سب سے بلند و بالا ہو گے۔ مومن، زوال پذیر ہوتا ہی اُس وقت ہے جب وہ مومن نہ رہے۔ اِس سے بات واضح ہو گئی کہ بندۂ مومن پر زوال اس وقت آیا جب وہ مومن نہ رہا۔ لہٰذا دریافت کرنے کی بات صرف اتنی ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے مومن، مومن نہ رہا۔ مومن ہونے کی خصوصیات یا شرائط پر ہم سالِ گذشتہ کے مذاکرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ اس میں ہم نے دیکھا تھا کہ — یقینِ محکم۔ عملِ پیہم۔ محبتِ فاتح عالم۔ وہ شمشیریں تھیں جن سے بندۂ مومن نے ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ لہٰذا، اس کے زوال کا سبب یہ ہے کہ اس میں نہ یقینِ محکم رہا نہ عملِ پیہم — اور جب یہ دونوں جوہر نہ رہے تو اِس میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا۔ اور احساسِ کمتری کا لازمی نتیجہ تنگ نظری۔ حسد۔ کینہ۔ دشمنی۔ تعصّب اور نفرت ہوتی ہے۔ اس قسم کے دلوں میں انسانیت سے محبت کہاں سے آ سکتی ہے؟ سو پہلی بات یہ ہوئی کہ مسلمان، زوال کا شکار اس لئے ہو گیا کہ اس میں یقینِ محکم نہ رہا۔ یقینِ محکم کس پر؟ خدا کے قوانین پر — قانون کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگر ایسا کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ (مثلاً) قانونِ خداوندی یہ ہے کہ اگر سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ خدا کے اس قانون پر ہمارا یقینِ محکم ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہم زندہ ہیں۔ اگر یہ یقین اُٹھ جائے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے۔ جس طرح خدا کا یہ قانون ہے کہ سنکھیا کھانے سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے، اسی طرح خدا کا یہ قانون بھی ہے کہ رزقِ حرام سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا اس قانونِ خداوندی پر بھی یقینِ محکم ہے؟ مومن جب عروج کی بلندیوں پر تھا تو اُس کا اِس قانونِ خداوندی پر کس طرح یقینِ محکم تھا؟ اِسے صرف ایک تاریخی واقعہ سے سمجھئے۔ جب ایران فتح ہوا تو اِس سے مسلمانوں کو اس قدر مالِ غنیمت ہاتھ آیا جس کا وہ کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ فاتحِ ایران حضرت سعدؓ نے وہ مال، خلیفہ (حضرت عمرؓ) کے پاس مدینہ بھیجا تو ساتھ ایک خط بھی لکھا۔ اُس خط میں تحریر تھا کہ آپ کو اس قدر مالِ غنیمت دیکھ کر جس قدر تعجب ہو گا، اس سے کہیں بڑھ کر تعجب اس بات سے ہونا چاہیئے کہ یہ تمام زر و جواہرات، سپاہیوں کو ایسے ایسے مقامات سے

ملے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس سے پہلے جنگوں میں رواج تھا کہ مالِ غنیمت میں سے جس سپاہی کے ہاتھ جو کچھ آ جاتا وہ اس کی ملکیت ہو جاتا۔ لیکن قرآنِ مجید نے یہ حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں ساری اُمت کا حصہ ہوتا ہے اس لئے اسے حکومت کے بیت المال میں جمع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ان سپاہیوں میں سے کسی نے اس میں سے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ مرکز میں جمع کر دیا ہے۔ وجہِ تعجب ان کے کیریکٹر میں یہ تبدیلی ہے جسے قرآن مجید پر یقینِ محکم نے ان کے اندر پیدا کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ خط پڑھا تو فرطِ مسرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے خط کا مضمون سنا تو کہا کہ اِبن الخطّاب! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے سپاہیوں میں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوگئی۔ یہ اِس لئے پیدا ہو گئی کہ آپ کا دامن پاک ہے۔ یہ تھا، میرے بزرگو! رزقِ حلال پر وہ یقینِ محکم جس نے مومن کو اِس قدر عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اور یہی ہے وہ یقینِ محکم جس کے نہ رہنے سے، وہی بندۂ مومن، آج کا مسلمان بن گیا اور ذلّت اور پستی کے گڑھے میں گر گیا۔ سنکھیا ایک فرد کو ہلاک کرتا ہے۔ رزقِ حرام پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ سنکھیا سے اجتناب' آپ کا مستقل شعارِ زندگی ہو۔ یہ نہیں کہ آپ کبھی تو سنکھیا سے پرہیز کر لیں اور کبھی اسے پھانک لیں۔ آپ جب بھی اسے پھانکیں گے۔ اس کا ہلاکت آفریں اثر ہو کر رہے۔ جو قوم زوال سے بچنا چاہتی ہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مستقل طور پر رزقِ حرام سے بچے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس قوم کا معاشی نظام' خدا کے قوانین کے مطابق قائم ہو۔ جس معاشی نظام کی بنیادیں باطل پر ہوں' اس میں رزقِ حرام سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس نظام میں حلال و حرام۔ یا جائز اور ناجائز کے معیار اور پیمانے اپنے ہوتے ہیں۔ اس میں ہو سکتا ہے (اور اکثر ہوتا یہی ہے) کہ جس کمائی کو وہ بالکل جائز لہٰذا حلال' قرار دے، قانونِ خداوندی کے معیار کے مطابق وہ یکسر ناجائز، لہٰذا حرام ہو۔ لیکن انسانوں کے خود ساختہ پیمانے، چیزوں کا نام تو بدل سکتے ہیں۔ ان کی تاثیر نہیں بدل سکتے۔ اگر ایک چھوڑ' ہزار پارلیمانیں بھی یہ فیصلہ کر دیں کہ آج سے سنکھیا کا نام' تریاق ہوگا اور اس کا عام استعمال جائز، تو اس سے سنکھیا کی تاثیر تو نہیں بدل جائے گی! دنیاوی پارلیمانیں تو ایک طرف، خود خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ لامحدود اختیارات اور قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود' سنکھیا کی تاثیر ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ تم ہمارے قانون — (سنت اللہ) میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ لہٰذا، اگر دنیا کے قوانین' اس رزق کو، جسے قانونِ خداوندی نے ناجائز قرار دے رکھا ہے، جائز قرار دے دیں، تو اس سے اُس کی ہلاکت آفرینی میں کوئی فرق نہیں آ جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس ہلاکت کو ہلاکت سمجھیں ہی ناں! سنکھیا کھانے سے بھی تو چہرے پر سرخی آ جاتی ہے۔ لیکن یہ سرخی صحت کی علامت نہیں ہوتی۔ خطرے کی سرخ جھنڈی ہوتی ہے۔

غلط نظام میں جب ہم رزقِ حرام یا ناجائز کمائی کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں اُن لوگوں کی طرف

اٹھا جاتی ہیں جنہیں ہمارا مذہب پرست طبقہ "دنیادار" کہہ کر پکارتا اور انہیں قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔
لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید جہاں رزقِ حرام اور ناجائز کمائی کا ذکر کرتا ہے تو پہلے اسی مذہب پرست طبقہ کا نام لیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں ہے کہ "اے جماعت مومنین! تم دیکھو گے کہ ان بزرگانِ طریقت (مشائخ) اور اربابِ شریعت (علماء) میں سے بیشتر ایسے ہیں جو لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں۔" وہ خود تو خدا کے راستے سے منحرف ہوتے ہی ہیں، دوسروں کو بھی اس راہ کی طرف آنے نہیں دیتے۔ جس طرح دنیادار یا بازاری اپنے خودساختہ قوانین سے، ناجائز کو جائز قرار دے دیتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی خودساختہ شریعت سے خدا کے ناجائز ٹھہرائے ہوئے کو جائز قرار دے لیتے ہیں اور سنکھیا کا نام تریاق رکھ کر اسے دھڑا دھڑ پھانکتے چلے جاتے ہیں۔ اس طبقہ کا پہلے ذکر کرنے کے بعد، قرآنِ مجید ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو انبار در انبار دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی بہبود پر صرف کئے جانے کے لئے کھلا نہیں رکھتے قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اے رسولؐ! ان دونوں طبقوں کو جہنم کے دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔
اصل یہ ہے کہ جو قوم، خدا کی منکر ہو اس کے ہاں، غلط نظام، اُن کی اپنی تدبیروں کے سہارے قائم ہوتا ہے لیکن جو قوم زبان سے خدا کا اقرار کرے اس کے ہاں غلط نظام، مذہبی پیشوائیت اور اربابِ دولت اور اقتدار کے گٹھ جوڑ سے قائم ہوتا ہے۔ سوچئے کہ جب یہ کہہ دیا جائے کہ جو شخص جتنی جی چاہے دولت جمع کرلے، سال کے بعد اس پر اتنی زکوٰۃ دے دے تو اس کا باقی سب مال پاک ہو جاتا ہے۔ جب یہ کہہ دیا جائے کہ جو شخص حج کر آئے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے گویا وہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ جب یہ کہہ دیا جائے کہ جو شخص یہاں مسجد بنوا دے، خدا اس کے لئے جنت میں موتیوں کا گھر تیار کر دے گا، تو ایسے معاشرہ میں جائز اور ناجائز کی تمیز کیسے پیدا ہو سکے گی؟ معاشرہ میں غلط نظام اس طرح پیدا ہوتا اور مستحکم رہتا ہے۔ اس سے امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غریبی۔ یعنی بےزری سے بھی کچھ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن قومیں تباہ ان جرائم کی وجہ سے ہوتی ہیں جو افراطِ زر۔ دولت کی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پانی کی کمی سے کشتی ریت میں دھنس کر ساکن ہو جاتی ہے۔ آگے نہیں چل سکتی۔ ڈوبتی نہیں۔ اس کے برعکس سیلاب اور طغیانی سے کشتیاں اس طرح ڈوبتی ہیں کہ نہ کشتی، کے تختوں کا نام و نشان ملتا ہے نہ سواریوں کی ہڈیوں تک کا اتہ پتہ۔ غریب، بہت زیادہ جرأت کرے گا، تو مسجد سے کسی نمازی کا جوتا چرا لے گا لیکن محلہ کا زردار چودھری زاہد مولوی صاحب سے مل کر مسجد کی ساری جائداد پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے گا۔ غریب گرہ کٹ، کسی راہرو کی جیب کاٹ لے گا، لیکن تاجر طبقہ، بزنس کے نام پر ایک دن میں ہزاروں لاکھوں کی جیبوں کی صفائی کر جائے گا گرمیوں میں دہائی مچ جائے گی کہ برف بیچنے والے، چار آنے کے بجائے آٹھ آنے سیر برف بیچ رہے ہیں، لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھے گی کہ برف کے کارخانے کا مالک، غلیظ پانی کی سلیں

دس دس روپے میں بیچ رہا ہے۔ جس زمانے میں چاولوں کے ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں لے جانے کی ممانعت تھی، ایک بڑھیا پانچ سات سیر چاولوں کی پوٹلیا، وزیر آباد کے کسی گاؤں سے لایا کرتی اور سہمی سہمی بیچا کرتی تھی۔ اس سے اسے دو تین روپے کا نفع ہو جایا کرتا ہوگا۔ اس پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھا کرتی تھیں۔ لیکن ملک کے سینکڑوں "سیٹھ عابد" لاکھوں۔ کروڑوں روپے کا مال سمگل کرتے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ جوتا چرانا، جیب کاٹنا۔ لہنگا بیچنا اور چاول سمگل کر کے لانا، جرم یہ بھی ہیں، لیکن قومیں تباہ، سیٹھ عابدوں اور چودھری زاہدوں کے ہاتھوں ہوتی ہیں۔ یا ہوتی ہیں دکن کے صادقوں اور بنگال کے جعفروں کے ہاتھوں۔ وہ بھی بھک منگے فقیر نہیں تھے۔ نہ ہی مجیب الرحمٰن، کوئی ناؤ چلانے والا ماجھی تھا۔ یہ سب زردار تھے جنہوں نے سلطنتیں فروخت کر دیں، قومیں نیلام کر دیں۔ خود ہمارے ہاں بے زروں کے خلاف مقدمات، چوری چکاری۔ گالی گلوچ۔ دنگا فساد کے جرائم کی بنا پر دائر ہوتے ہیں۔ استحکامِ مملکت کے خلاف کارروائیوں کے الزام میں ماخوذ بالعموم زردار ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ واٹر گیٹ سیکنڈل کے اداکار بھی، دنیا کی سب سے بڑی زردار مملکت کے سب سے بڑے زردار طبقہ کے افراد ہی تھے۔ لیکن اس کی وجہ ان کی زرداری نہیں تھی، بلکہ وہ بدعنوانیاں تھیں جو زر کو بے لگام رکھنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ زر اگر بے لگام ہو تو اس سے فرعون اور قارون پیدا ہوتے ہیں جو قوموں کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ اگر اسے قانونِ خداوندی کی لگام دے دی جائے تو اس سے ابوبکرؓ صدیق اور عثمان غنیؓ پیدا ہوتے ہیں جو کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی قوم کو قیصری و کسریٰ کے تخت و تاج کا وارث بنا دیتے ہیں۔ یہ ہے قوموں کے عروج و زوال کا ابدی قانون۔ والسلام

۱۶۔ سلمیٰ پرویز

میرے واجب الاحترام بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو۔

میری بہن نے میرے فلسفہ دان ہونے پر میری چٹکی لی ہے۔ حالانکہ یہ بھی مجھ پر ناحق تہمت ہے۔ میں فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔ فلسفہ کی نہیں۔ بایں ہمہ، وہ بڑی بہن ہے۔ جو جی میں آئے کہہ لے لیکن اگر گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اسے ہی فلسفہ کہتے ہیں۔ فلسفہ کے معنی ہیں معقول بات۔ ہو سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں معقول بات کہنا جرم ہو۔ لیکن کم از کم طلوعِ اسلام کے اسٹیج پر تو ایسا نہیں۔ بہرحال اب میں موضوعِ مذاکرہ کی طرف آتی ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر کے پہلے مصرعے میں کہا ہے کہ:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے

جب اُن کے انداز کے مطابق اِس سبب کو ہم بھی سمجھتے تو ظاہر ہے کہ وہ خود اسے ہم سے بھی زیادہ واضح طور پر سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے، قیاسات کی وادیوں میں سرگرداں پھرنے کے بجائے، انہیں سے کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ بندۂ مومن کے زوال کا اصلی سبب کیا ہے۔ اسے انہوں نے اس شعر سے (جو ہمارے مذاکرہ کا موضوع ہے) اگلے ہی شعر میں بتا دیا ہے۔ جب کہا کہ ؎

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

یہاں وہ تونگری کے مقابلہ میں قلندری لاتے ہیں۔ قلندر یا قلندری — علامہ اقبالؒ کی بڑی جامع، مقبول اور محبوب اصطلاح ہے جسے انہوں نے اپنے کلام میں بکثرت استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاح مردِ مومن کے جرأت مندانہ کردار کی صحیح صحیح آئینہ دار ہے۔ حمیت۔ غیرت۔ خودداری۔ جرأت۔ شجاعت۔ حق گوئی۔ بے باکی۔ بے خوفی۔ استغناء۔ شانِ بے نیازی۔ سب خصوصیات اس ایک اصطلاح کے اندر سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ بندۂ مومن کا زوال، قلندرانہ صفات کے نہ رہنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں: ؎

اے لا اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

اقبالؒ کا یہ بھی دعوٰی ہے کہ انہوں نے جو صداقتیں پیش کی ہیں ان کا سرچشمہ قرآنِ مجید ہے۔ آئیے ہم قرآنِ مجید سے بھی پوچھیں کہ قوموں پر زوال کیسے آتا ہے اور بے زری اور زوال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ قرآنِ مجید نے ہمیں بتایا ہے کہ مفلسی، غریبی، محتاجی، بے زری، خدا کا عذاب ہے۔ لیکن یہ چیزیں قوموں کے زوال کا باعث نہیں، بلکہ زوال سے پیدا ہوتی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۱۲ میں ہے:

> اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والے نہایت امن، اور اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ سامانِ زیست کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اُن کی طرف چاروں سمت سے کھنچا چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں سے کفر برتا۔ ان کی ناسپاس گذاری کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہ سب ان کا اپنا کیا کرایا تھا۔ خدا نے یونہی ایسا نہیں کر دیا تھا۔ (۱۶/۱۱۲)

اس سے ظاہر ہے کہ بے زری (مفلسی اور غریبی) نتیجہ ہوتی ہے کفرانِ نعمت کا۔ اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کفرانِ نعمت کے ذمہ دار کون ہوتے ہیں! اس کا جواب سورۂ ابراہیم کی آیت

اٹھائیس میں ان الفاظ میں ملتا ہے :-

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا۔ اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا سودا کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یعنی جہنم میں۔ (۱۴/۲۸)

اس سے ظاہر ہے کہ کفرانِ نعمت ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں اور اپنے سمیت قوم کو جہنم میں جا گراتے ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کی نعمتیں اس کا عذاب نہیں۔ یہ تو بہت بڑا انعام ہے جو حسنِ عمل کے بدلے میں ملتا ہے۔ چنانچہ صدرِ اوّل کے مومنین کے متعلق کہا کہ تمہاری مجاہدانہ تگ و تاز کا نتیجہ تھا کہ :-

خدا نے تمہیں تمہارے دشمنوں کی زمینوں کا۔ ان کی بستیوں کا۔ ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا۔ اور اس کے بعد وہ تمہیں ان علاقوں کا بھی مالک بنا دے گا جن تک ابھی تم پہنچ نہیں پائے۔ (۳۳/۲۷)

لہٰذا حکومت اور سلطنت۔ دولت و ثروت۔ مال و متاع خدا کے انعامات ہیں۔ اور قوموں کے عروج اور سرفرازی کا نشانیاں۔ خدا کا عذاب یا زوال ان نعمتوں کے کفران سے آتا ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کفرانِ نعمت سے مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید نے اسے بھی واضح الفاظ میں بتا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ان نعمتوں کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کی مقرر کردہ اقدار (VALUES) کے مطابق صرف کیا جائے تو اسے شکرِ نعمت کہا جائے گا اور اگر انہیں ان قوانین کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ چنانچہ اس نے صدرِ اوّل کے انہیں مومنین کو جنہیں اس نے اپنی بے بہا نعمتوں سے نوازا تھا وارن (WARN) کر دیا کہ :-

دیکھنا! کہیں تمہارا مال و دولت اور آل اولاد تمہیں قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل نہ کر دے یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ (۶۳/۹)

اس صورت میں یہی مال و دولت اور اولاد تمہارے لئے فتنہ کا موجب بن جائے گا۔ (۶۴/۱۵)

واضح رہے کہ قدیم قبائلی زندگی میں چونکہ قبیلہ یا خاندان کی افرادی قوت بڑی اہمیت رکھتی تھی، جس طرح آجکل پارٹی کے ممبروں کی تعداد اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے مال و دولت کے ساتھ افرادِ خاندان کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہرحال اس نے کہا یہ ہے کہ یاد رکھو! مال و دولت کی فراوانی تمہیں قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل نہ کر دے۔

قرآن مجید نے اپنے اس واقعے کی شہادت میں، کہ جب مال و دولت کو قوانینِ خداوندی کے خلاف استعمال کیا جائے تو اس سے تباہی آ جاتی ہے، سابقہ قوموں کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کے اوراق در اوراق ان قوموں کی داستانوں سے معمور ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ قوم غریب ہو گئی اس لئے اس پر زوال آ گیا۔ اس نے یہی کہا ہے کہ دولت کی فراوانی کے نشہ سے قومیں اس قدر مدہوش ہو گئیں کہ انہوں نے اقدارِ خداوندی کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ زوال اور تباہی تھا اور غریبی اور بے زری۔ اس نے سب سے پہلے قوم نوحؑ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ :-

انہیں مال و دولت کی فراوانی۔ باغات کی کثرت اور سلسلۂ آبپاشی کی بہتات حاصل تھی، لیکن چونکہ اُن کا بالادست طبقہ، زیردستوں کو ذلیل اور قابلِ نفرت سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ قوم تباہ ہو گئی۔ (۱۷/۱۲-۱۳)

اس نے قومِ سبا کے متعلق کہا ہے کہ:-

جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کی طرف سے خدا کے پیغام بر آئے اور انہوں نے ان سے کہا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا تو انہوں نے اُن کا مذاق اُڑایا اور ان کے طبقۂ امرا کے نمائندوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس قدر مال و دولت ہے، اِس لئے ہم پر تباہی کس طرح آ سکتی ہے؟ (۳۴/۳۴-۳۵)

اور وہ اس طرح تباہ ہوگئے کہ ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔

اس نے قومِ فرعون کے متعلق کہا ہے کہ انہیں حکومت اور سلطنت بھی حاصل تھی۔ نیز باغات اور چشمے۔ لہلہاتی کھیتیاں اور نہایت شاندار محلات۔ آسائش و آرائش کے بیش بہا سامان اور طرح طرح کی نعمتیں۔ لیکن انہوں نے کمزور قوموں کا استحصال کیا۔ انہیں اپنا محکوم و محتاج بنایا۔ ان کے معززہ افراد کو ذلیل و خوار کیا۔ انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کی اجتماعی قوت کو کمزور کر دیا۔ مختصر یہ کہ انہیں ظلم و استبداد کا نشانہ بنا دیا، تو یہ تمام نعمتیں ان سے چھن گئیں اور ان کا مالک دوسری قوم کو بنا دیا گیا۔ (۴۴/۲۵-۲۸)

ایک مقام پر ان تمام تفاصیل کو سمٹا کر یوں بیان کر دیا کہ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھو۔ ان میں تمہیں نظر آ جائے گا کہ ہم نے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جن کے ہاں مال و دولت اور دیگر سامانِ معیشت کی بڑی فراوانیاں تھیں۔

اس کے بعد اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ تباہ وہ قوم ہوتی ہے جس کا نظام ظلم و استبداد، ناانصافی اور استحصال پر مبنی ہو۔ یہاں قرآنِ کریم نے واضح کر دیا کہ قوموں کے زوال کا باعث بے زری نہیں ہوتی ــــــ اس کا باعث ظلم و استبداد پر مبنی نظام ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا۔ تباہ ہونے والی قومیں خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کرتی ہیں۔ ان قوموں کے تدبر کی فسوں سازیاں انہیں اِن کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے بچا نہیں سکتیں۔ ان کا علم و ہنر بھی ان کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت علامہ نے جو کہا تھا کہ: ؎

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

تو اس سے اُن کی مراد یہی تھی کہ قوموں کو زوال، اقدارِ خداوندی سے اعراض برتنے کی وجہ سے آتا ہے اور بے زری اس زوال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خود ہماری اپنی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ بنو عباس کی سلطنت کی شان و شوکت کی مثال دنیا میں کم ملے گی۔ اُن کے ہاں مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن چونکہ نظام باطل تھا اس لئے وہ مملکت تباہ ہو گئی اور اس تباہی کے نتیجہ میں قوم محتاجی اور مفلسی کے عذاب میں گرفتار

ہوگئی۔ ہندوستان میں مغلوں نے دو سو سال تک نہایت دبدبے اور طنطنے سے حکومت کی لیکن اورنگ زیب کے بعد، اوپر کے طبقہ میں ایسی اخلاقی کمزوریاں آگئیں کہ اس سلطنت کی بنیادیں تک کھوکھلی ہوگئیں اور اسے سوداگروں کی ایک کمپنی اُچک کر لے گئی۔ اس کے بعد قوم بے زری کے جس عذاب میں مبتلا ہوئی اُس کے تصوّر سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ دوسری قوموں میں روما کی سلطنت اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اس کی تباہی کیوں ہوئی، اس کی وجہ تاریخ تہذیب کے مشہور مؤرخ بریفا کے الفاظ میں سنئیے۔ وہ کہتا ہے :۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدّر ہے۔ روما کی سلطنت عوام کو لوٹ کر ایک خاص طبقہ کو دولت مند بنانے کا ذریعہ تھی۔ انھوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبّر "خلوص اور دیانتداری" سے چلایا۔ لیکن حسنِ انتظام کی یہ خوبیاں بنیادی باطل کو اُس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط نظام کے نتائج بلا رو رعایت سامنے آکر رہے۔

بریفا کے اس تجزیہ میں ایک نکتہ زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ باطل نظام میں عوام کو لوٹ کھسوٹ کر، اوپر کا طبقہ دولت مند بن جاتا ہے۔ یہ طبقہ دولت کی فراوانی سے بدعنوانیوں پر اتر آتا ہے۔ اس سے قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اور اس مقام پر مذہب کو آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر بے زروں کو معلوم ہو جائے کہ ہماری بے زری کی وجہ، طبقۂ اُمرا کی لوٹ کھسوٹ ہے تو وہ اس طبقہ کی بوٹیاں نوچ لیں، لیکن مذہبی پیشوائیت ان مفلسوں اور محتاجوں کو تھپکیاں دے دے کر سلاتی رہتی ہے۔ وہ ان سے یہ وعظ کہتی ہے کہ :۔

غریبی اور امیری سب خدا کے ہاتھ میں ہے وہی رزق کی تقسیم کرتا ہے۔ کسی کو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اور کسی کو نانِ شبینہ تک کا محتاج کر دیتا ہے۔ اس سے غریبوں کو پریشانیاں تو ضرور اٹھانی پڑتی ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ غریب اور مفلس خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔ دنیا کی تکلیف چند روزہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد جنت انہی کے حصے میں آتی ہے۔ قیامت میں غریب لوگ انبیاء، اولیاء کے ساتھ کھڑے ہوں گے کیونکہ وہ بھی انہی کی طرح غریب اور نادار تھے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہئے۔ قسمت اور مقدّر کا گلہ کبھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ خدا کے فیصلوں کے خلاف شکایت ہوگی۔"

مذہبی پیشوائیت، بے زروں کو یہ افیون پلاتی رہتی ہے اور اس طرح قوم کے زوال کو لازوال بنا دیتی ہے۔ اقبالؒ ساری عمر اس افیون کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ اُس نے کبھی اہلِ طریقت کو للکار کر کہا کہ؛

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

اور کبھی قسمت اور تقدیر کا وعظ کہنے والوں سے کہا کہ :-

نہ ہے ستارے کی گردش، نہ بازیٔ افلاک،
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

خودی کی موت سے مراد ہے قلندرانہ صفات کا باقی نہ رہنا۔ قوم کا اخلاقی اقدار سے عاری ہو جانا۔ اور یہیں سے علامہ اقبالؒ اس زوال سے نکلنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ وہ بے زروں سے کہتے ہیں کہ یہ افتاد جو تم پر آن پڑی ہے اس کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوتی، تم اوپر کے طبقہ کے جرائم کی پاداش میں اس عذاب میں گرفتار ہو گئے ہو۔ لیکن اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تم اگر ہمت کرو تو اس جہنم سے نکل سکتے ہو۔ اس کیلئے اوّلین شرط یہ ہے کہ تم اپنی غیرت اور حمیت کو مت بیچو۔ وہ بظاہر اپنے بیٹے، جاوید کو مخاطب کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت قوم کی نئی نسل سے کہتے ہیں کہ :-

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اگر بے زری میں غیرت اور حمیت کی حفاظت کر لی جائے تو قوم کا زوال پھر سے عروج میں بدل سکتا ہے۔ حضرات انبیاءِ کرام اسی قسم کے بے زروں میں خودی کو بیدار کر کے انہیں بامِ عروج تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ خود حضور نبیٔ اکرمؐ کے عہدِ مبارک کو دیکھئے۔ بے زری کا یہ عالم تھا کہ بدر کی لڑائی میں مجاہدین کے پاس پوری تلواریں بھی نہیں تھیں۔ ایک اور جنگ کے تذکرہ کے سلسلہ میں قرآن مجید میں ہے کہ مجاہدین حضورؐ کی خدمت میں آتے تھے کہ انہیں سواری مہیا کر دی جائے۔ اور جب حضورؐ بھی معذرت کا اظہار فرما دیتے تو وہ باچشمِ نم واپس چلے جاتے۔ بے زری کا تو یہ عالم تھا اور استحکامِ خودی کی یہ کیفیت کہ جب اس صحابی کے پاس جن سے جنگ میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جماعت نے قطعِ تعلق کر رکھا تھا، شام کے ایک سردار کا خط آیا کہ اگر آپ کی قوم آپ کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتی ہے تو آپ میرے ہاں آ جائیے۔ یہاں ہر قسم کا اعزاز و احترام آپ کو حاصل ہوگا تو انہوں نے خط کو تنور میں جلا دیا اور پیغام رساں سے کہا کہ اگر قاصدوں کی حفاظت کا دستور نہ ہوتا تو میں تیری بھی گردن مار دیتا۔ یہی تھے وہ خوددار، بے زر، جنہوں نے چند ہی دنوں میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ اسی بے زری کو اقبالؒ "فقرِ غیور" کہہ کر پکارتا ہے، اور زوال پذیر امتِ مسلمہ سے کہتا ہے کہ :-

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

بے زری اور بازری کا یہی فرق ہے جسے وہ ان الفاظ میں واضح کرتا ہے کہ :-

خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

لہٰذا۔ زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں۔ بے غیرتی سے ہے۔ اخلاقی اقدار کو فراموش کر دینے سے ہے۔

والسلام

سعادتِ بشیر

(یہ مقالہ، بزمِ مذاکرہ میں پڑھا نہیں جا سکا تھا۔ بایں ہمہ اسے شاملِ اشاعت کیا جاتا ہے۔)

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اقوام اور افراد کے عروج و زوال کے اسباب و علل دریافت کرنا تاریخ دانوں کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ قرآن کا بنیادی موضوع انسان ہے، لہٰذا اس کے اوراق میں بنی نوعِ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر محیط قوانین دیئے گئے ہیں۔ زیست کے نشیب و فراز میں جو عوامل انسان کے ساتھ ہوتے ہیں، ان میں مال و زر کو کیا اہمیت اور کیا مقام حاصل ہے، اس کا جواب ہمیں ان قوانین میں تلاش کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

سورۃ النحل میں قرآن کہتا ہے:-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲)

خدا ایک مثال کے ذریعے ایک حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے۔ ایک ایسی بستی تھی جس کے رہنے والوں کو امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی۔ رزق کی اتنی فراوانی کہ چاروں طرف سے کھنچا چلا آتا تھا۔ اس قوم نے (بعد) ان نعمائے خداوندی سے کفر برتا تو بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ یہ خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

اور یہ کوئی واحد مثال نہیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا۔ (۲۸/۵۸)

ایسی قومیں بہت تھیں جنہیں بڑی معاشی فراوانیاں حاصل تھیں (لیکن) جو تباہ ہو گئیں۔

اس کی وجہ بھی اس نے بتا دی۔ یعنی ــــ "کفرانِ نعمت" ــــ خدا کا حکم تھا کہ رزق کھاؤ ــــ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ۔ (۲۰/۸۱) اور ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیمِ رزق غیر متوازن ہو جائے۔ جنہوں نے اس کی خلاف ورزی کی نعمائے خداوندی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تباہ ہو گئے۔

رزق کی یہ تقسیم غیر متوازن اسی وقت ہوتی ہے جب اس قوم کے افراد کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ سامانِ زیست کو جمع کرنا شروع کر دیں اور اس طرح ایک ظالمانہ نظام کو قائم کر دیں ــــ ایسا نظام جس

ہیں، بال کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا کر ایک مقصودو منزل کی مانند کر لیا جائے۔ ظاہر ہے، یہ کیفیت ایک نفسیاتی تبدیلی کی غمازی کرتی ہے جو افراد میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ قرآن بھی بنیادی طور پر نفسیات کی کتاب ہے۔ آئیں دیکھیں کہ قرآن میں انہی نفسیات کا کیا ذکر کیا گیا ہے۔

انسان کے اعمال اس کی عقل کے سہارے انجام پاتے ہیں۔ لیکن عقل جس طرح مختلف عوامل کے زیرِ اثر ہوتی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ مختصر یہ کہ وحی کی روشنی کے بغیر عقل انسان کی جبلتوں کے تابع ہوتی ہے۔ یہ جبلتیں ——— جذبۂ تحفظِ خویش اور جذبۂ تغلبِ خویش ——— انسان کی خواہشات کو مختلف لبادے پہناتی رہتی ہیں۔

تحفظِ خویش زندگی کا جبلّی تقاضا ہے۔ زندگی کا دارومدار سامانِ رزق پر ہے۔ اسی لئے انسانی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹ لے۔ اسی سے انفرادی زندگی کا وہ فساد شروع ہوتا ہے جو معاشرہ کو جہنم بنا دیتا ہے۔ انسان کے اعمال کا مقصد اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سامانِ تحفظ فراہم کرنا ہو جاتا ہے۔

جذبۂ تغلب بھی دراصل نہایت شدید احساسِ عدمِ تحفظ کی ہی ایک شکل ہے۔ اس کی بنیاد میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ اپنے لئے ایسی حیثیت یا مقام کسی طرح حاصل ہو جائے جہاں کسی قسم کی تباہی، آفت، نقصان اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ یہی چیزیں بلا پیچ نفسیاتی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور فرد ہمہ وقت انہی جذبوں کی تسکین کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے لئے ہی ہونا چاہیئے ابلیس کہلاتا ہے۔ اس نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ:

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ۔ (۴/۱۱۹)

میں انہیں گمراہ کروں گا اور ان کے دل میں جھوٹی آرزوئیں بیدار کرتا رہوں گا۔

پس یہ آرزوئیں ابھرتی رہتی ہیں اور ان کے حصول اور ان کی تکمیل کی خاطر انسان جو کچھ کرتا ہے، ابلیس، یعنی اس کے جبلّی تقاضوں میں گرفتار عقل، ان اعمال کو خوشنما، خوش رنگ اور صحیح بات کر کے پیش کرتی ہیں۔

یہ ناسد صورتِ حال مزید یوں بگڑتی ہے کہ ہر طرف نظر دوڑانے پر میکانکی نظریۂ حیات سامنے آتا ہے۔ جس کا ملخص یہ کہ ؎

درنگاہش آدمی آب و گِل است ——— کاروانِ زندگی بے منزل است

اسی کا نام کفر ہے۔ یعنی اپنی ذات سے انکار، جس کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ وحی و رسالت پر اور آخرت کی زندگی سے انکار، تو اس تصورِ حیات کا عَروۃ الوثقیٰ ہے۔ چنانچہ اس تصور کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین انسان کا منتہائے زندگی قرار پا جاتا ہے۔ ان کی خاطر ہی اس کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چنانچہ مال و زر جمع کرنا، اس کا مقصود ہو جاتا ہے کہ نہ صرف ان کے بل بوتے پر جذبات کی تسکین کی جائے بلکہ اپنے لئے اس قدر فائدہ، تغلب اور تحفظ حاصل کیا جائے کہ اس کو کسی قسم کا خوف نہ رہے، کیونکہ اسی خوف سے محفوظ رہنے کے لئے وہ یہ ساری تگ و دو کرتا ہے وہ خوف اس کے سرکش جذبات کا پیدا کردہ ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ۔ (۲/۲۶۸)

شیطان تمہیں بے سرو سامانی سے ڈراتا ہے۔

مال و زر جمع کرنے کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوتا ہے کہ لاکھوں افراد رزقِ خداوندی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس طرح مال روک کر بیٹھ جانے سے اسے وہ احساسِ تحفظ حاصل نہیں ہوتا جس کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ مال جمع تو اس امید میں کرتا ہے کہ اس طرح حیاتِ دوام حاصل کر لے گا۔ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخْلَدَہٗ (۱۰۴/۳) لیکن وہ نہ صرف طمانیت، و سکون و قلب سے محروم رہتا ہے بلکہ اس کا دل اضطراب و کشمکش کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔ (۱۰۴/۶-۷)

ایسی آگ اس کو لپیٹ میں لے لیتی ہے جس کی حدت سے اس کا قلب و ذہن جلتا رہتا ہے۔ یہی پستی کی زندگی فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ۔ (۱۰۱/۹) ہے جس میں انسان کے دل و دماغ کچھ کام نہیں دیتے اور وہ نہایت ذلت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی نَارٌ حَامِیَۃٌ (۱۰۱/۱۱) ہے۔ بھڑکتی آگ اس سے کوئی فرار نظر نہیں آتا۔

اس الم انگیز عذاب کی وجہ یہ ہے کہ:

وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ۔ (۴۷/۳۸)

جو دوسروں کو مال و دولت سے محروم کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادت و کامرانیوں سے محروم کر لیتا ہے۔

ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس انسان کو زندگی کے مقاصد سے غافل کر دیتی ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں اس ہوس کی تسکین ہو جائے۔ انسان ساری عمر اس میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ (۱۰۲/۱-۲)

اس طرح ہر فرد معاشرہ دوسرے سے کٹ جاتا ہے۔ شیطان ان کے درمیان شگاف بلکہ (WEDGES) ڈال دیتا ہے۔ (بعد و تعصبیں)۔ ہر شخص یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ۔ (۹۰/۱۵) کی کیفیت میں گرفتار ہوتا ہے ایسے افراد نہ تو کشمکش حیات کے معرکوں میں جنگ آزما ہو سکتے اور نہ ہی اپنے تمام تر ساز و یراق کے باوجود آگے بڑھ سکتے ہیں۔ یہیں قرآن کہتا ہے۔

مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی۔ (۹۲/۱۱)

ان کا مال ان کے کچھ کام نہیں آتا۔

ان تمام عوارض کی وجہ قرآن نے یوں بیان کی ہے اور اس کا حل یوں بتایا ہے:۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔ (۷/۱۷۶)

اگر وہ ہمارے قانونِ مشیّت کے مطابق چلتا تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے لیکن وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا۔ اور اپنے جذبات کی اتباع ہی میں اُلجھا رہا۔

اسی قانونِ مشیّت میں اس صورتِ حال کا مداوا موجود ہے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷) ہے۔ انسان کے تمام نفسیاتی امراض اور الجھنوں کا علاج ہے۔

یعنی ان عوارض کا علاج جو ابلیس کے پیدا کردہ ہیں۔ جو اس کے قلب و ذہن کو یوں لپیٹ لیتے ہیں کہ اسے کسی لمحے چین نہیں ملتا۔ لیکن جب تک بے راہرو جبلّت کی گرفت رہے گی شیطنیت کا پنجۂ گرفت مضبوط رہے گا، اس وقت تک وہ اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا جو عدمِ تحفظ کے احساس نے اس سے چھین لیا ہے۔ کیونکہ قرآن نے نفسیات کا بنیادی قانون بتا دیا ہے کہ :-

اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۔ (۱۹/۴۴)

شیطان تو ہمیشہ رحمان کی سرکشی کرتا ہے۔

جہاں ایسی ذہنیت موجود ہو جو میکانکی نظریۂ حیات سے مغلوب ہو، جس پر سرکش جذبات غالب ہوں جس کی جبلّت بے مہار ہو، وہاں صفتِ رحمانیت جگہ پا ہی نہیں سکتی۔ گویا افراد کے دل میں سودِ خویش کی جگہ سودِ ہمہ کا تصوّر اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک اس منفی نظریہ سے انکار نہ کر دیا جائے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب ابلیس (یا شیطان) سے کہا جاتا ہے کہ تو یہ غلط نظام کو قائم کرنے کے لئے کیوں کوششیں کرتا ہے۔ کیوں معصیت کرتا ہے تو وہ وہی جواب دیتا ہے جو اس نے خدا کو دیا تھا۔

اَغْوَيْتَنِيْ ۔ (۱۵/۳۹) تو نے مجھے گمراہ کیا۔ میں اپنی لغزش کا ذمہ دار نہیں۔ میں تو مجبور ہوں۔ تو ہی سب کچھ کراتا ہے۔

یعنی یہ ذہنیت اسی طرح جواب دیتی ہے کہ "رزق تو خدا کے ہاتھ میں ہے"۔ اپنی ذمہ داری تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے اور اس طرح اپنی بازآفرینی کے دروازے خود بند کر دیتی ہے۔ چنانچہ پہلا قدم تو اس ابلیسانہ ذہنیت سے انکار کا ہے۔ ورنہ یہ اندرونی جہنم کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ غلطی کو غلطی تسلیم ہی نہ کیا جائے تو اصلاح ناممکن ہے۔

ایک طرف یہ انکار ہو اور دوسری طرف، مثبت طور پر قرآنی اقدار پر ایمان لایا جائے۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان۔ اس طرح تسلسلِ حیات پر ایمان لانے سے بقا کے جو قوانین سامنے آتے ہیں وہ بتا دیتے ہیں کہ جس ابدیت کی خواہش یوں انسان کو تڑپاتی ہے اس کے حصول کا طریق کیا ہے۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔
اسی لئے :-

مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۵۹/۹)

فلاح اسی کے لئے ہے جو شحِّ نفس سے بچ جائے۔

اس طرح جبلّت پیدا کردہ بقائے دوام کا تصور منہدم ہو جائے گا اور اس کی جگہ ربوبیت عالمینی کا تصور آ جائے گا۔ گویا اب وہی عقل جو تن تنہا ہونے کے باعث عقلِ خود بین بن گئی تھی، وحی کا اتباع کرنے سے جہاں بین بن جاتی ہے اور اس طرح نہ صرف جبلی تقاضوں کی صحیح طریقے سے تسکین کر دیتی ہے بلکہ ذاتِ انسانی کے ارتقا کا سامان بھی کر دیتی ہے۔ اور اسے اس کی تمام تر ذہنی کشمکش سے نجات دلا کر طمانیت کے نور سے مالا مال کر دیتی ہے۔ یہ سب قرآنی معاشرہ میں حاصل ہوتا ہے۔ سورۂ فجر کی آیات اس کو نکھار کر سامنے لاتی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ایک ایسا نظام ہے جس میں تم لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ (۸۹/۱۷) اکیلے اور تنہا شخص کی عزت نہیں کرتے۔ اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، نہ مساکین کے لئے رزق کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے۔ (۸۹/۱۸) اور معاشرہ میں لوٹ کھسوٹ کا یہ عالم کہ میراث کا مال تک ہضم کر لیا جاتا ہے۔ (۸۹/۱۹) مختصر یہ کہ :-

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۔ (۸۹/۲۰)

تم مال سے نہایت شدید محبت رکھتے ہو۔ اور چاہتے ہو کہ اردگرد سے تمام مال سمٹ کر تمہارے پاس ہی جمع ہو جائے۔

تو ایسے لوگوں کا نہایت بُرا انجام ہونے والا ہے۔ کیونکہ جب وحی خداوندی پر مبنی نظامِ خداوندی برپا ہوگا، تب اس قسم کے لوگ تاسف سے الم انگیز عذاب کے جہنم میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس وقت تمام معاشی ناہمواریاں مٹا دی جائیں گی۔ (۸۹/۲۱-۲۶)

گویا یہ اس شخص کا مرقع کھینچ دیا گیا ہے جس کی نفسیات ہم دیکھتے آئے ہیں۔ پھر قرآنی انقلاب کا تذکرہ جلیلہ ہے جس میں ان لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے اور پھر اس کا ذکر ہے جو وحی خداوندی کا اتباع کرتا ہے جو اپنے ربّ کے ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ اس طرح خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے سے پست مفادِ خویش کی خاطر استعمال ہونے والے اختیار و ارادہ یعنی 'ایغو' اور انسانی سطحِ زندگی پر جذبات پر قابو رکھنے والی عقل پر حکمران ذات، انسانی میں کشمکش ختم ہو جاتی ہے۔ ذات، پست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے، عقلِ خود بین عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے۔ یہیں قرآن اسے پکارتا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔ (۸۹/۲۷)

اے نفسِ مطمئن۔ یعنی وہ نفس جو اپنی داخلی کشمکش سے محفوظ ہو اور علیٰ وجہ البصیرت اسے یہ

سکون حاصل ہو۔
اس طرح وہ نشوونما پائے گا اور تکمیلِ ذات کے مراحل طے کرتا چلا جائے گا۔ یہی رضوان اللہ ہے جو اسے حاصل ہوگی۔ گویا رب یعنی نشوونما کے تمام مراحل (ابتدا تا انتہا) طے کرانے والے کی اس صفتِ ربوبیت کو اپنے اندر منعکس کرنے سے رضوان اللہ حاصل ہوگی۔

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔ (89/28)

لیکن یہ جنت، یہ وقتیتِ دوام اسی صفتِ ربوبیت کو تمام نوعِ انسان کے لئے عام کر دینے سے حاصل ہوگی۔ صحیح انفرادی مفاد کو انفرادی طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پس:

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۔ (89/29)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوشگوار سامانِ زیست بھی ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہیں تکاثر ہی کی خواہش تھی تو ہم نے

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۔ (108/1)

تمہیں کوثر عطا کر دیا۔ زندگی کی خوشگواریاں کثیر تعداد میں تمہیں دے دیں۔
اس سب کو حاصل کرنے کا طریق جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۔ (104/2) نہیں۔ کہ یہ عدد میلین کا طریق ہے۔
کوثر کو حاصل کرنے کا طریق ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ (108/2)

اپنے رب کے نظامِ صلوٰۃ کے قیام کے لئے کوشاں ہو جاؤ اور پوری طرح علم و عقل کی رو سے اس پر حاوی ہو کر مضبوطی سے عمل پیرا رہو۔
آج کے مومن کو یہی کچھ کرنا ہے ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

ادارہ طلوعِ اسلام کے اوقاتِ کار میں تبدیلی کی اطلاع

عام ہفتہ واری تعطیل اتوار کی بجائے جمعہ کے روز کرنے کے فیصلہ کے پیشِ نظر، دفتر ادارہ کے اوقاتِ کار اب حسبِ ذیل ہیں:

ہفتہ کے روز سے جمعرات تک متواتر ...... دو بجے دوپہر تا آٹھ بجے شام
جمعہ کے روز ...... سات بجے صبح تا بارہ بجے دوپہر

(ناظمِ ادارہ)